تناسخ

اور

مسئلہ حیات بعد الموت

مصنفہ

حضرت خواجہ کمال الدین صاحب بانیٔ مسلم مشن ووکنگ (انگلستان)

اپریل ۱۹۲۸ء

میں

خواجہ عبد الغنی سکرٹری مسلم مشن ووکنگ عزیز منزل لاہور نے شائع کی

مطبوعہ رفیق عام پریس ریلوے روڈ لاہور

باہتمام میاں محمد صدیق صاحب پرنٹر مطبع چھپی

اِنتساب

بی بی خدیجۃ الکبریٰ رئیسہ گیا کو جو خاص شغف اشاعتِ
حق میں ہے۔ وہ ذوقِ سلیم اُن کے صنف میں مفقود تو نہیں۔
ہاں شاذ و نظر آتا ہے۔ آپ ہی اِن اوراق کو روشنی میں لاتے
کا باعث ہیں۔ اِس لئے میں نے یہی پسند کیا ہے۔ کہ اس
کتاب کو آپ کے نام نامی پر ہی مُعنون کردوں +
کیا عجب ہے۔ کہ ہماری دوسری بہنیں بھی اِس قسم کے لٹریچر کی
اشاعت کا موجب ہو جائیں میرا قلم کسی عوضہ کے بغیر
ایسی خدمت کیلئے ہر وقت حاضر ہے۔ اگر مسلم خواتین اس امر کیطرف
توجّہ فرمائیں +

خواجہ کمال الدین

مورخہ ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء
عزیز منزل برانڈرتھ روڈ۔ لاہور (پنجاب)

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حامداً و مصلیاً

الصُّلح خیر

ہندوستان نے آج کل نئے دور میں قدم رکھا ہے۔ اہل ہند کو سمجھ آنے لگ گئی ہے۔ کہ ملک کی بہبودی اس ملک کے عناصر مختلفہ کے اتحاد پر آ رہی ہے۔ سیاسی امور میں بھی جو باتیں ہندو مسلم اتحاد کی طفیل ان گذشتہ پانچ چھ سالوں میں اہل ہند کو حاصل ہو گئی ہیں۔ ان کے حصول میں گذشتہ نصف صدی کی کانگرسی کوشش بیسود رہی۔ یہ تو بدیہہ بات ہے۔ کہ اتفاق اور محبت سے ہی اس ملک کا سدھار ہو سکتا ہے۔ اختلاف رائے تو

کوئی بُری چیز نہیں - یہ تو بالفاظ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم انسان کے لئے رحمت ہی رحمت ہوتا ہے - شرط یہ ہے - کہ اس اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی کوئی امر عناصر مختلفہ کو جمع کردے - یا بالفاظ دیگر وہ باتیں ہم میں سے مٹ جائیں جو شقاق و نفاق کا موجب ہو رہی ہیں - یہ کائنات کا عظیم الشّان نظام اپنے اندر لا تعداد اور حدود و قیاس سے بیروں تر عناصر کو اپنے اندر لئے ہُوا ہے - وہ اپنے خواص میں ایکدوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں - لیکن کسی ترکیب ابلغ نے انھیں ایک دوسرے سے ملاکر کائنات کو بہترین اور مفید ترین شکل دے رکھی ہے - ایک ہی قسم کے ذرات تو آپس میں ترکیب بھی نہیں کھاتے - یہ تو اُن کا تخالف ہی ہے - جو انھیں کسی حکیم کے ہاتھ تلے ایک جگہ جمع کر کے عمدہ سے عمدہ شکلوں میں ڈھال دیتا ہے ✦

الغرض اختلاف رائے اختلاف قوم کوئی چیز نہیں - البتہ اس اختلاف میں سے ایسے عناصر کو الگ کر دینا چاہئے - یا اُن کے اثر کو کمزور کر دینا چاہیئے جو فساد کا موجب ہو جاتے ہیں ✦

اختلاف مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو اس ملک کو بظاہر تباہی کی طرف لیجا رہی ہے۔ اسی نے ایک مدت تک ہندو مسلم کو ایکدوسرے کا دشمن بنا کر اُنھیں کسی کام کا نہ رکھا۔ اب چند صداقت شعار لوگوں نے کوئی راہ ہندو مسلم اتحاد کی نکالی۔ اور اس نے معتدبہ فوائد بھی دیئے۔ تو ان کے جیل میں چلے جانے کے بعد جس چنگاری نے اس اتحاد کے گھر کو آگ لگا دی۔ وہ مذہبی لباس میں ہی آ ظاہر ہوئی۔ حاضر الوقت شدھی۔ ارتداد کا مسئلہ بالکل اور قطعاً سیاسی اغراض کا ایک مجسمہ ہے۔ ابھی سوراج کی کوسوں دور ہے۔ یا محض ایک وہم ہی وہم ہے۔ اور اگر اس میں کوئی حقیقت ہے۔ تو یہ آخر کار وہم ہی وہم رہ جائیگا۔ اگر ہندو مسلم کی یہی حالت رہی تاں بعض ہندو بھائیوں نے ابھی سے خیال کر لیا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد سے ہماری تعداد زیادہ ہونی چاہیئے۔ تاکہ سوراج ہر معنوں میں ہندو سوراج ہو۔ لہٰذا شدھی کا معاملہ چھیڑ دیا گیا۔ اگر تو اس شدھی میں کوئی مذہبی غرض ہوتی۔ تو نہ سنگٹھن بنتا نہ شدھی کے متعلق یہ طریق عمل ہوتا۔ کہ وہ جس طبقۂ ہندو میں

شامل ہونا چاہئے ہو جائے سناتنی اور سماجی عقائد تو ایکدوسرے کے بالکل متضاد اور مخالف ہیں پھر اس کے کیا معنے ہیں۔ کہ ایک اچھوت کو سماجی کوششیں تو ہندو قوم میں لائے۔ لیکن اُس کے شُدھ ہونے پر اُسے سناتنی بنایا جائے۔ خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں شدھ شدہ کو سناتنیوں میں رہنا ہو۔ یہ مذہب نہیں یہ پولیٹیکل اغراض ہیں *

یاد رکھو! کہ اس ملک سے نہ ہندو نہ مسلمان مٹ سکتے ہیں۔ یہ شُدھی کی کوشش ایک بیہودہ کوشش ہے اس سے غرض حقیقی بہت دُور جا پڑتی ہے۔ اگر سواراج اس ملک کے لئے مفید ہے۔ تو پھر شدھی کے ذریعہ ہندو سواراج لیتے لیتے سواراج ہی ہاتھ سے نہ گنوا لو۔ اگر نیک نیتی سے سماجی کوشش اچھوت کو شدھ کرتی ہے۔ تو پھر اُسے سماجی بناؤ۔ اُسے سناتنی کیوں بننے دیتے ہو۔ اگر اُس کا سناتنی بننا ہی اچھا ہے۔ اور اُس کی آتما کنتی اسی میں ہے تو پھر خود کیوں سناتنی نہیں بن جاتے یہ طریق تو بہت ہی غلط ہے۔ اس سے تو صحت نیت پر بھی

کسی کو شبہ کرنے کا حق حاصل ہے +

میں یہ نہیں کہتا۔ کہ سب کے سب اہل ہند مسلمان یا ہندو ہو جائیں۔ یہ تو محالات سے ہے لیکن اہل ہند میں رواداری کا جذبہ ہی مضبوط ہو جائے تو بہت سی مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ اس رواداری کے جذبہ کی جس قدر آبیاری اسلام نے کی ہے۔ اُس کی نظیر دُنیا میں نہیں۔ جب قرآن نے ہی یہ تعلیم دے دی۔ کہ ہر ایک مذہب اپنی اصل شکل وصورت میں خدا کی طرف سے تھا۔ اور اُسی کا نام اسلام تھا۔ یعنی خدا کی راہوں پر چلنا اور پھر ساتھ ہی یہ بھی تعلیم دی۔ کہ دُنیا کی کوئی قوم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہادی اور نبی سے خالی نہیں۔ اور اس صحیح عقیدہ کے ماتحت ایک مسلم اس بات کا پابند ہے۔ کہ وہ ہر ملک وہر قوم کے ہادیان یا بانیان مذہب کو عزّت سے دیکھے۔ اور اُنھیں خدا کا فرستادہ اور اس کی طرف سے اُس قوم کی طرف ہادی سمجھے تو پھر کس قدر تنازعات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر میں جناب کرشن کی عزّت کرتا ہوں۔ اور اُنھیں خدا کا فرستادہ ہادی سمجھتا ہوں۔ جو ہندوستان

کی ہدایت کے لئے خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے۔ اور اگر میں اُن کے لئے وہی عزّت کے کلمات اور دل میں بھی اُن کی وہی عزّت محسوس کرتا ہوں۔ جو آنحضرت صلعم سے پہلے کسی ملک یا قوم کے نبی کے لئے میں دل میں رکھتا ہوں۔ تو کیا مجھ میں اور ہندو بھائیوں میں جو کرشن کے پرستار ہیں بہت حد تک محبّت و مُودّت کا رشتہ پیدا نہیں ہو جاتا۔ اگر ایک وجُود دو شخصوں کی محبت کا موجب ہو جائے۔ تو اُن دو شخصوں میں لازماً محبّت پیدا ہو جاتی ہے سناتنیوں میں تو کسی ہادی مذہب کے خلاف کچھ کہنا جائز نہیں۔ سماجی بھائی یہ اخلاق سناتنیوں سے لیلیں۔ مسلمانوں کے ہادی اور بزرگوں کو نا ملائم الفاظ سے یاد نہ کیا کریں۔ ستیارتھ پرکاش سے ایسے اوراق کو ہی نکال دیں۔ جن میں دوسرے ہادیان مذہب پر بیجا حملے کئے گئے ہیں۔ ان اوراق کے متعلق بعض سماجیوں کا تو یہ بھی خیال تھا۔ کہ یہ حصے الحاقی ہیں۔ میری اپنی بھی یہی رائے ہے۔ بہرحال دوسروں کے بزرگوں کی عزّت کرنا سیکھو۔ تو بہت حد تک یہاں کی پیچیدگیاں سیاسی ہوں یا سوشل

ختم ہو جائینگی - کسی مُسلم کے لئے تو یہ وعظ کرنے کی ضرورت نہیں - قرآن کریم ایک طرف تو اس قسم کے سب وشتم سے روکتا ہے - دوسری طرف دوسرے مذاہب کے ہادیوں اور بانیوں کو خدا کے نبی اور رسُول قرار دیتا ہے ؛

ایک مُسلم کا تنازعہ کسی دوسرے مذہب والوں سے اسی قدر ہے - کہ اُن کے مذہب سے جو عقاید اسلامی عقاید سے مختلف تعلیم دیتے ہیں - وہ اُن کے بزرگوں کے تعلیم دادہ نہیں - کیونکہ دیگر مذاہب بھی وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے ہی آئے تھے - اُن کی تعلیمات بھی حقہ ہی تھیں - البتہ مرور ایام اور عدم اسباب حفاظت کتب سابقہ کے باعث مختلف مذاہب میں اہل مذاہب نے اُن کی اپنی اصلی تعلیم کے خلاف نئی تعلیمات داخل کر دیں انہی کی اصلاح کے لئے قرآن کریم آیا ہے - اس نے ہر مذہب کی قدیمی صحیح تعلیمات کو قبول کر لیا اور جہاں اختلاف دیکھا وہاں بدلائل بینہ اصلی تعلیم کو پیش کیا - اس سے آج کوئی انکار کر سکتا ہے - کہ قریباً کُل کی کُل کتب سابقہ محرّف و مُبدّل

ہو گئیں - اُن کے بہت سے حصص مٹ گئے - جو نہ بچے وہ زمانہ کے دستبرد سے اصلی حیثیت کو قائم نہ رکھ سکے - آج توریت والے توریت کو اور انجیل والے انجیل کو خود محرف و مبدل مانتے ہیں - زبور پر ژند وستہ پر بھی یہی اعتراض ہے - خود ان کتابوں کے پرستار انھیں اصلیت سے گرا ہوا تسلیم کرتے ہیں - جب یہ مقدس کتابیں اپنے پیروؤں کی تحقیق میں بھی اصلیت سے رگر چکی ہیں - تو اُن کی تعلیم کی بناء پر یہ لوگ کیوں دوسروں سے مجادلہ مخاصمہ کرتے ہیں - جب انجیل موجودہ اپنے اندر حقیقی تعلیم بھی نہیں رکھتی - اور ابتدائی مسیحی صدیوں کے راہبوں نے رات دن اس میں نئی تعلیمات ملا دیں - لہٰذا یہ کتابیں ربانی تعلیم کو اپنے اندر نہیں رکھتیں - پھر ان کی تعلیم کی بنیاد پر کسی اور سے تنازع ہی کیوں ہو - ہاں یہ بھی ضروری نہیں کہ قرآن کی تعلیم کو کوئی اس لئے مان لے کہ یہ کتاب محرف مبدل نہیں ہوئی - ایسی حالت میں عقل - علم - تجربہ - مشاہدہ منطق وغیرہ سے امورِ متنازعہ کا فیصلہ ہونا چاہئے +

جب ان سابقہ کتابوں کی یہ حیثیت بعثت نبوی پر ایسی ہو چکی تھی۔ تو سمجھ نہیں آتا۔ کہ کیوں ایسے وقت کوئی کتاب نئی نازل نہ ہو۔ جب ہدایت انسانی کے لئے اگر خداوند وقتاً فوقتاً صحیفے بھیجتا رہا۔ اور ہمیشہ بروقت ضرورت اس کی طرف سے کتابیں آتی رہیں۔ تو اس کی بھیجی ہوئی ہدایات کے مبدّل محرّف ہونے پر وہ ہادیٔ حقیقی کیوں صحیح ہدایت کو از سرِ نو نہ بھیجتا۔ صحیفہ قدرت میں جہانتک جسمانیات کا تعلق ہے۔ یہی رنگ ہمیں چاروں طرف نظر آرہا ہے۔ جب ضرورت انسانی کی کوئی چیز ضائع ہو جاتی ہے۔ یا قابل استعمال نہیں رہتی۔ تو اس کے قائمقام نئی چیز آجاتی ہے کائنات کا پتہ پتہ اس پر شہادت دیتا ہے۔ ہر سال نئے پانی کا اس لئے آنا کہ پچھلے سال کا آسمان سے اُترا ہوا پانی حیات عالم کے لئے اپنے اندر کافی مواد نہیں رکھتا۔ کیا اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ کہ اگر روحانی پانی اپنی اصلی حیثیت میں نہ رہے۔ یا وہ کسی وجہ سے اپنا فائدہ نہ دے سکے تو اس کی جگہ نیا پانی آئے۔ ان دو امور کو قرآن کریم

نے نہایت خوبصورت طریق پر بیان کیا۔ فرمایا۔
وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی
اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یؤمنون ٥
واللہ انزل من السماء ماءً فاحیا بہ الارض بعد
موتھا ان فی ذالک لآیۃ لقوم یسمعون (سورۃ نحل)
ما ننسخ من آیت او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا
یعنے قرآن کریم ہمنے اس لیئے نازل کیا۔ کہ پرانے
مذاہب کی تعلیمات ہیں جو اختلاف ہوگیا ہے۔ انھیں
بدلائل مٹا دیا جائے (اور اصل تعلیم دی جائے) اور
قرآن اس طرح ماننے والوں کے لئے ہدایت اور
رحمت کا موجب ہو جائے۔ سُننے والو اگر کان ہے
تو سُن لو۔ کیا اللہ تعالیٰ ہر سال بارش بھیج کر زمین کو
زندہ نہیں کیا کرتا۔ غور کرنے کے لیئے یہ ایک نشانی
ہے۔ یہ کتابیں ہی جو خدا کی طرف سے آتی ہیں۔
رُوحانی بارش کا کام دیتی ہیں۔ مُردہ دل کی زمینیں
اس سے زندہ ہوتی ہیں۔ اب اگر پرانی کتابیں
مٹ گئیں یا تغیر ہوگئیں۔ تو یہ تو اُسی قسم کا پانی ہے۔
جو جھیلوں اور جوہڑوں میں اور جھپڑوں میں موجود ہوتا ہے
اس سے تو زمینیں کافی طور پر صحیح طور پر سرسبز نہیں

ہو سکتیں - اِن کی زندگی تو بارش کے نئے پانی سے ہی وابستہ ہے - اب اگر قرآن کریم کے نزول پر یہ کتابیں اپنی اصلی حیثیت کو کھو بیٹھی تھیں - تو پھر کیوں خدا کی کتاب از سر نو نازل نہ ہو - جب ان کتابوں کے ماننے والے ہی انہیں محرف مُبدل مانتے ہیں - تو پھر جو ضرورت حقہ اُن قدیمی کتابوں کو کسی وقت زمین پر لائی - وہ بعثت نبوی پر آموجود ہوئی تھی - اسلئے ضروری تھا کہ خدا کی طرف سے کوئی کتاب نازل ہو - وہ قرآن ہے *

وید کی صحت کے متعلق میں یہاں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا - یہ کہا جاتا ہے - کہ ان چار ویدوں کے علاوہ اور بھی بہت سے وید تھے - خود کرشن جی مہاراج بھی صحت وید پر متشکی نظر آتے ہیں - رامائن میں بھی ایسے ہی اشارات ہیں - لیکن اس بات کو چھوڑ دیا جائے - اگر یہ مان بھی لیا جائے - کہ وید مُقدس تغیر تبدل کے ہدف میں نہیں آیا - تو بھی وید کا حال اس خزانے کا سا ہے - جس کی کنجی گم ہو چکی ہے - یا اُس آسمانی پانی کی طرح ہے - جو زمین میں یا پہاڑوں کی کھوہ میں غائب ہو گیا ہے - پانی

تو شاید اصلی حالت میں ہے۔ لیکن انسان کے ہاتھ اُس تک نہیں پہنچ سکتے۔ اب انسان اس غائب شُدہ پانی کی تلاش کرے۔ یا آسمان کی طرف نئے پانی کے لئے دیکھے۔ اس استعارے سے میری مراد وید کی زبان کا مفقود ہو جانا ہے۔ آج وید کے سمجھنے والے کہاں ہیں؟ زبان کی دقّت اور مشکلات نے سناتنی ترجمے کو سماجیوں کے نزدیک اور سماجی معانی وید کو سناتنیوں کے نزدیک بے اعتبار کر رکھا ہے۔ مشکل تو یہ ہے۔ کہ مختلف قسم کے متضاد عقاید کے پیرو ان عقائد مختلفہ کو وید سے ہی نکالتے ہیں۔ صداقت تو ذو وجہین نہیں ہوتی۔ دو متضاد عقائد میں سے ایک ہی عقیدہ صحیح ہو سکتا ہے۔ اب اگر دونوں کے دونوں عقاید وید سے ہی نکالے جاتے ہیں۔ تو کم از کم ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ کہ وید کی زبان ناقابل فہم ہو گئی ہے۔ اور اگر یہ حالت ہے۔ تو کیوں وہی صداقتیں جو وید میں تعلیم ہو چکی ہیں۔ اور جو آج سمجھی نہیں جاتیں از سرِ نو کسی اور زبان میں تعلیم نہ ہوں۔ کیونکہ وید کی زبان تو ناقابلِ فہم ہے۔ لہٰذا اُن کے مفہوم خواہ

کسی ہندی زبان میں از سر تو اوا ہوں۔یا ہندوستان سے باہر کسی اور زبان میں ہوں یہ امر بالکل بے تعلق ہے اسی حقیقت کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے۔کہ جب کائنات میں کوئی چیز غائب ہو جائے یا قابل استعمال نہ رہے۔تو اُس کی جگہ نئی چیز آتی ہے۔یا۔تو اُسی کے مثل ہوتی ہے۔یا اُس سے بہتر ہوتی ہے کیوں وید کی اس حالت پر کوئی نئی کتاب اُس جیسی یا یا اُس سے بہتر نہ آئے +

آج ہندو مسلمان میں ایک قسم کا تنازعہ ہے۔اس تنازعہ کے مشتعل کرنے والے زیادہ تر وہی ہیں۔جو مذہبی پلیٹ فارم پر کام کرتے ہیں۔نہ معلوم ان میں کیوں اس قدر جوش ہے۔بلکہ سیاسی اغراض بھی مذہبی شکل میں حاصل کی جاتی ہیں۔جیسے کہ آج شُدھی کا معاملہ ظاہر کرتا ہے۔بہرحال اختلاف تو مذہب کا ہی ہو رہا ہے۔اور تو کوئی نہیں۔مذہب اگر خدا کی طرف سے ہے۔تو سب کو ایک ہی شکل میں ملا ہوگا۔یہ خیال کرنا۔کہ وید ہی خدا کی طرف سے نازل ہوا۔یہ بھی خالی خوش فہمی ہے۔وید اگر سب کے لئے ہوتا تو سب جگہ

پہنچ گیا ہوتا۔ اس کا ہندوستان سے باہر نہ جانا ثابت
کو چاہتا ہے۔ کہ دوسرے ممالک میں ربّانی علم کبھی اور نام
تلے آئے۔ ہندوستان میں برسا ہوا پانی کُل دُنیا کی
آبیاری کے لئے نہیں بھیجا جاتا۔ ہر ملک میں زندگی
کے قیام کے لئے الگ الگ بادل برستے ہیں۔ یہی
حالت رُوحانی بارش کی ہے۔ جس کا نام الہام ربّی
ہے۔ وید اگر محرّف نہیں ہوا۔ تو اس کا صحیح مفہوم
قرآن سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ نہ قرآن کا کوئی
مسئلہ ایسا ہو گا۔ جو کسی کلام ربّانی کے خلاف
ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ان باتوں کی تنقید کر لی جائے
جو یہاں مذہباً موجب اختلاف ہو رہے ہیں۔ یہ
اختلاف ملکی مفاد کو خطرناک نقصان پہنچا رہا ہے
جہاں تک تو اعمال یا کرم کانڈ کا سوال ہے۔ دو
گروہوں میں کہاں فرق ہو سکتا ہے۔ بدی ہر جگہ
بدی ہے۔ اور نیکی ہر جگہ نیکی ہے۔ جو امور مسلمانوں
کے نزدیک مستحسن ہیں وہی امور قریب قریب
ہندو یا سماجیوں کے نزدیک پسندیدہ ہیں
لمبا چوڑا فرق تو دو ہی عقائد کا ہے۔ ایک تناسخ
دوسرا قدامت مادہ کا۔ یہی دو عقیدے مایۂ ناز

سماج ہیں۔ اور لُطف یہ ہے۔ کہ دونوں عقاید کا۔ جہاں تک ہماری تحقیق ہے۔ وید سے کوئی تعلق نہیں +

بالفرض ان دو عقیدونکو الگ رکھا جائے۔ اور بعض اخلاق اور روحانیات کی تعلیم کی عزت کیجائے۔ تو پھر کیوں سماجی مسلمانوں کو اور مسلمان سماجیونکو بُرا بھلا کہیں۔ بشرطیکہ وجہ فساد مذہب ہی ہو۔ کچھ سمجھ نہیں آتی۔ کہ یہ عقاید کیوں اسقدر باعث فساد ہو رہے ہیں۔ حالانکہ تناسخ یا قدامتِ مادّہ پر خود ہندو بھائیوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ خود جناب کرشن جی مہاراج ہی یہ نہیں مانتے کہ آواگون کے چکر ختم نہ ہونگے۔ جیسا کہ دیانند جی مہاراج تعلیم دیتے ہیں۔ کرشن جی کے نزدیک انسان آخر کار برہم لوک میں پراپت ہوکر ان قالبوں کے بدلنے کو ختم کر دیتا ہے۔ لہٰذا کرشن جی کی تعلیم کے ماتحت کسی شخص کا اس دُنیا میں پھر واپس آنا نظر نہیں آتا۔ ایک جنم سے دوسرے جنم میں جانے کے تو وہ ضرور قائل ہیں۔ لیکن اس سے مراد واپسی نہیں

بلکہ ایک کے بعد دوسرا جنم جو اُوپر کو ہے۔ وید میں تناسخ
کے متعلق کوئی صریح تعلیم نہیں۔ ہاں قدامت
مادّہ و رُوح کو وید سے جس فقرہ سے نکالا ہے۔ وہاں
نہ مادّہ کا ذکر ہے نہ رُوح کا۔ وہاں تو کسی درخت
کی ایک شاخ پر ایک جانور کے نر مادہ بیٹھنے کا
ذکر ہے۔ ان نر مادہ کو رُوح اور جسم قرار دینا محض
زبردستی ہے۔ اب اگر یہ دو مسئلہ خود وید کی تعلیم تلے
مخدوش حالت میں ہیں۔ خود بعض ہندو بھائی
تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ان کا ذکر وید میں نہیں۔ تو پھر
سمرتی تحریریں تو ربانی سند نہیں ہوتیں۔ بالمقابل
قرآن اِن دو مسائل کے خلاف تعلیم کرتا ہے۔ لہٰذا
بہتر ہے۔ کہ ان ہر دو مسائل کو اس وقت الٰہی تعلیم
سمجھا جائے۔ جب اس عقل و فہم و مشاہدہ صحیفہ کے
میزان میں تول لیا جائے۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ اگر
سماجی بھائی ان دو عقاید کو الگ کردیں۔ تو پھر
ان کے جھگڑنے کا یا ہم سے اختلاف کرنے
کا کونسا امر رہجاتا ہے۔ لہٰذا میں نے پسند کیا۔
کہ ان دو مسائل پر یعنے تناسخ اور قدامت مادہ
پر اسلامی نقطۂ خیال کو پیش کردوں۔ ہمارے

ہندو بھائی اس پر غور کریں۔ وہ دیکھیں کہ آخر جو کچھ بھی ہم عقیدہ رکھتے ہیں۔ اگر وہ اپنے اندر معقولیت کو لئے ہوئے ہے۔ تو پھر ہم سے کیا تنازعہ کیوں ایسے مسئلہ پر جھگڑا کیا جائے۔ جس پر وید کی توضیح سند نہیں۔ باقی بعض ہندو حکماء کے قول ہیں۔ اور وہ غلط ہو سکتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسے ثابت ہوں تو انہیں چھوڑ دیا جائے۔ تناسخ کے چھوڑنے پر تو کوئی ہندو مذہب سے خارج نہیں ہو جاتا۔ بیسیوں ہندو فرقے اسے نہیں مانتے۔ ہاں بعض اصحاب کے پاس باتیں کرنے کو کچھ نہیں رہتا۔ ان باتوں کا اب خاتمہ ہی ہو جانا چاہیئے۔ ملک کا مفاد اتفاق و اتحاد چاہتا ہے۔ وید کی اصل تعلیم و مفہوم کو اگر قرآن کے مقابل لایا جائے۔ تو اہلِ وید کو کوئی تعارض قرآن سے نہ رہیگا۔ باقی تناسخ اور مسئلہ قدامت مادہ کو بالتصریح وید سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی کتاب سے کھینچ تان کر کوئی مسئلہ نکالنا مسئلہ کی حیثیت کو گنوا دیتا ہے۔ بعض ہندو بزرگوں کے یہ خیالات ہیں۔ اگر یہ غلط ثابت ہوں تو انہیں چھوڑا جائے۔ خصوصاً جبکہ یہی باتیں

عقیدہ میں داخل ہوکر باعث فساد ہو رہی ہیں۔
ہندو مذہب میں تو لا تعداد فرقے ہیں۔ ایسے
عقاید ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ میرا مطالعہ
اور تحقیق اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ کہ اسلام
کا کوئی بھی ایسا عقیدہ نہیں جو ہندو مذہب کے کسی نہ کسی
فرقے کا عقیدہ نہ ہو۔ فرق اتنا ہی ہے۔ کہ اسلام
نے اُن عقاید کو نہایت خوبصورتی سے اور دلائل
سے مبرہن اور مضبوط کیا ہے۔ اور مقصد خلقت
انسانی کے حصول کے لئے بہتر سے بہتر اور مختصر
سے مختصر اور نئی سے نئی راہیں بتلائیں جو پہلے موجود
نہ تھیں۔ گذشتہ مذاہب کی راہیں کسی قدر پیچیدہ
نہیں۔ اور مشکلات سے خالی نہ تھیں۔ گو منزل مقصد
عموماً ایک ہی تھی۔ اسلام نے آسان راستے اس کی
جگہ قائم کر دیئے۔ اب اگر اعتقاد کی یہ صورت ہے۔
کہ جو کچھ بھی ہم مانتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کے کسی نہ کسی فرقے
کا عقیدہ ہے۔ تو پھر مسلمانوں سے یہ کیوں تنازعہ
ہے۔ کیا صحیح معنوں میں توحید کے پرستار برہمو نہیں
یا ایک حد تک آریہ نہیں۔ کیونکہ مسئلہ قدامت مادہ نے
اُن کے عقیدہ توحید میں ایک قسم کی خلل اندازی کی ہے۔

اسلام کی حقیقت دو لفظوں میں سمجھ آسکتی ہے۔ اہل ہنود کے مختلف فرقوں کے بعض بعض عقاید کو لے کر ایک جگہ جمع کریں۔ اُن میں اسلام کے عقاید کی تعلیم بہت حد تک آجائیگی۔ پھر اگر ان عقاید کی موجودگی پر تم ہندو فرقوں کو ایک سمجھ رہے ہو تو ہم سے کیوں فساد ہے۔ اسلئے کہ ہم باہر سے آئے تم بھی آخر ایک وقت باہر سے آئے تھے۔ ہم میں آپ میں تو صرف صدیوں کا ہی فرق ہے۔ البتہ تم نے جو سلوک اصلی باشندوں سے کیا۔ وہ ہمنے آپ سے نہیں کیا +

ان اوراق میں میں نے صرف مسئلہ تناسخ پر بحث کی ہے۔ جو کچھ قرآن کریم نے اس موضوع پر کہا ہے وہ میں نے یہاں لکھ دیا ہے۔ جناب کرشن کا مسلک اس مسئلہ میں وہی ہے۔ جو ایک مسلم کا مسلک ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ سماجی بھی اور دوسرے ہندو بھائی اس کتاب کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں۔ یہ باتیں کسی ہار جیت کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ میں تو مذہب کے معاملات میں ہار جیت کی خواہش کو ایک لعنت سمجھتا ہوں۔ مینے سچی صداقت اور محبت سے قلم کو اٹھایا ہے

جو وجوہ مجھے تناسخ کے ماننے سے روک رہی ہیں۔ وہ ہیں نے ایک حد تک لکھ دیئے۔ اور اگر تو شرافت اور دیانت ہماری کوششوں کی محرک ہے۔ تو ہندوستان بہترین دن دیکھ سکتا ہے۔
آخر میں میں ایک بات کہنی چاہتا ہوں۔ جسے میں نے بار بار ان اوراق میں دہرایا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جو عقائد نظری رنگ میں ہوں۔ اور جن کا ثبوت کسی مشہود و محسوس طریق پر نہ ہو سکتا ہو۔ اُن کی صحت کو جانچنے کا ایک صحیح پیمانہ یہ ہے۔ کہ اُس عقیدے کا عملی اثر انسان کی زندگی پر دیکھا جائے۔ اگر کسی عقیدے پر قائم ہو کر یا اُس عقیدے کے ماتحت انسانی زندگی عملاً صحیح نتائج پیدا کرے تو اُسے تسلیم کیا جائے۔ اور اگر وہ عقیدہ بداعمالی کی طرف لیجائے یا اُس سے اخلاق میں کمزوری واقع ہو یا وہ عقیدہ ترقیٔ انسانی کا محرک نہ ہو تو پھر لاکھ خشک منطق اُس کی مؤید ہو اُسے ترک کرنا ہی لازم ہے +

خواجہ کمال الدین

چونکہ مسئلہ تناسخ کو مسئلہ حیات بعد الموت سے تعلق ہے۔ جس میں اسلامی مسئلہ جنت و دوزخ بھی آجاتا ہے۔ اسلئے میں نے اخیر میں ان مسائل پر کچھ مختصر سی بحث کر دی ہے +

خواجہ کمال الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

الحمد للہ ربّ العٰلمین الرّحمٰن الرّحیم مالک یوم الدّین

مذاہب مختلفہ میں اختلاف عقائد و اصول کی بنیاد دراصل اُس اختلاف نے ڈال رکھی ہے جو ایک مذہب دوسرے مذہب سے صفاتِ الٰہیّہ کے مفہوم میں رکھتا ہے۔ مثلاً اگر خدا تعالےٰ کو لم یلد و لم یولد (جس کا نہ کوئی بیٹا ہے نہ وہ کسی کا بیٹا ہے) مان لیا جائے۔ تو اسلام اور عیسائیت کے جملہ باہمی جھگڑے فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔

اگر خُدا تعالےٰ کو رحمٰن تسلیم کر لیا جائے ۔ جس سے مُراد یہ ہے ۔ کہ اُس کے فضل اور انعام بے بدل ہوتے ہیں ۔ اور ہر ایک مخلوقِ الٰہی اُن فیوض سے کسی مُعاوضہ کے بغیر بہرہ مند ہوتی ہے ۔ تو پھر کفّارے کی کیا ضرورت ہے ۔ کیونکہ اس مسئلہ کی بُنیاد یہی ہے کہ ربّ العٰلمین کا فضل اور اس کا رحم بلا بدل نہیں ہوتا ۔ الغرض میں نے کسی مذہب کے کسی اختلافی اصُول کو ایسا نہیں پایا ۔ کہ جس کی تہ میں صفاتِ باری کے متعلّق اختلاف نہ ہو ۔ خدا تعالےٰ کی کتاب نے اسی لئے اپنے ابتدا میں مندرجۂ عنوان صفات کا ذکر کر دیا ہے ۔ ان صفات کے مفہوم میں اُن تمام کے تمام عقائد کی ایک لطیف اور معقول تردید ہو جاتی ہے جو مذاہبِ مختلفہ نے اسلام کی تعلیم کے برخلاف تجویز کر رکھے ہیں ۔ یعنے جو خدا تعالےٰ کو اُن صفات سے متصف مان لے ۔ وہ غیر اسلامی عقائد کو مان نہیں سکتا ۔

ذاتِ خُداوندی کی کُنہ سے کون واقف ہو سکتا ہے

تھوڑا بہت جو بھی ہمارا علم ہے ۔ وہ اُن صفات تک محدُود ہے ۔ جن کا ذکر کسی کتاب ربّانی میں ہو ۔ یا

جو خدا کی اس کتاب مبین میں نظر آ رہا ہے جسے صحیفہ
فطرت کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کی ننانوے
صفات بیان کی ہیں۔ یہ وہی ننانوے صفات ہیں
جن میں خداوند کی شکل کائنات میں ظاہر ہو رہی
ہے۔ اگر ایک اہل بصیرت کائنات کے آئینہ میں خالق
کائنات کا چہرہ دیکھنا چاہے تو اس کے خط و خال
اُسے وہی نظر آئیں گے۔ جن کا نقشہ قرآن کریم
نے ان صفات الٰہیہ میں کھینچا ہے۔ یہ سب کی سب صفات
ان چار صفات میں آ جمع ہوتی ہیں۔ جن سے قرآن کریم
شروع ہوتا ہے۔ یعنے رب العلمین۔ رحمٰن۔
رحیم۔ مالك يوم الدين۔ اور اگر نظر غائر سے
دیکھا جائے تو رب العلمین کے بعد جن تین صفات
کا ذکر ہے۔ وہ بھی صفت رب العلمین ہی میں آ جاتے ہیں
بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عالمین۔ اس کی
رحمانیت۔ رحیمیت اور مالکیت کی تحت میں ظاہر ہوتی
ہے۔ یہ ایک بسیط مضمون ہے۔ جس کی تفصیل
کے یہ اوراق متحمل نہیں ہو سکتے۔ البتہ جس موضوع
پر میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی ہے۔ اُس کا
زیادہ تر تعلق صفت رب العلمین اور رحمٰن سے ہے

ربوبیّت عالم کا ایک ممتاز ی رنگ جو ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے یہ ہے۔ کہ کائنات کے اجزا۔ اُنکی مختلف شکلیں۔ اُس کے مختلف ہیولے۔ ایک صفت خاصہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک چیز کا قدم اپنی بلوغت اور نشو و نما میں آگے کو ہے۔ کوئی چیز پیچھے نہیں ہٹتی نہ واپس آتی ہے بلکہ شاہراہ ترقی پر قدم زن ہو رہی ہے۔ ذرّے ذرّے میں لاتعداد استعدادیں اور قوتیں موجود ہوتی ہیں۔ جن کا ظہور بتدریج ہوتا جاتا ہے۔ کسی درخت کے تخم کو دیکھ لیجئے۔ اُس کے اندر کونپل۔ شاخیں تنہ پتے۔ پھول۔ پھل۔ ذائقہ۔ ریاح اور خدا معلوم کیا کیا خواص چھپے ہوئے ہیں۔ جن کا ظہور آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک جگنو کی روشنی ہی آخر کار ایک زبردست برقی روشنی بن جاتی ہے۔ دُور کیوں جائیں نُطفۂ انسانی کو دیکھئے جن کے اندر غیر مرئی کیڑے ہیں۔ جنھیں تیز سے تیز خوردبین ہی دیکھ سکتی ہے۔ ان ننھے کیڑوں میں ایک انسان کا زبردست ہیولے ہے جس میں کُل کائنات کے جوہر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ سارے کے سارے اعضائے انسانی۔ پھر مختلف جذبات

اخلاق ۔ رُوح طرح طرح کے ذہنی قوے اور بہت سی لاتعداد چیزیں جن کا دن بدن ظہور ہو رہا ہے آ جمع ہوئے ہیں ۔ لفظ رب کے ایک یہ بھی معنے ہیں ۔ رب سے مُراد وہ ہستی ہے ۔ جو اول ہر ایک چیز میں مختلف استعدادیں اور قوتیں رکھ دیتی ہے ۔ پھر اُن قوتوں کو حدِ کمال تک پہنچانے کے اسباب پیدا کر دیتی ہے اور جس جس منزل ترقی میں سے اشیائے کائنات نے گذر کر اپنے کمال کو پہنچنا ہے ۔ اُن سب کو تجویز کرتی ہے ۔ ہر ایک ضرورت کا انتظام کرتی ہے ۔ اور کسی چیز کو نہیں چھوڑتی ۔ جب تک کہ وہ اپنی بلوغت کو نہ پہنچ جائے ۔ بلوغت کے عربی زبان میں بھی یہی معنے ہیں ۔ یعنے جو جو مخفی قوتیں کسی چیز میں ہوں وہ اپنی نشو نما پا جائیں ۔ آج مغربی دُنیا مسئلہ ارتقا (ایولیوشن) پر نازاں ہے ۔ اس کی حقیقت لفظ ربوبیت میں آ جاتی ہے ۔ قرآن نے بھی سب سے اوّل اس حقیقت سے دُنیا کو آشنا کیا ؛

الغرض ہر ایک چیز اپنے کمال تک پہنچنے کی ساعی ہے اُس کا قدم آگے کو ہے پیچھے کو نہیں ہے ۔ ربوبیت کی یہی شان ہے ۔ لہذا جو شخص اللہ تعالے کو

رب العلمین مانتا ہے۔ وہ کس طرح کسی ایسے عقیدے کا
قائل ہوسکتا ہے۔ جو اشیاے عالم کے مضمرہ جوہر کے
متعلق رجعت قہقری کا قائل ہو۔ اور یہ سمجھے کہ
چیزیں آگے کو نہیں بلکہ پیچھے کو آجاتی ہیں۔ جیسے کہ
مسئلہ تناسخ تعلیم کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ انسان
جو سُلالہ طین ہے۔ جس نے جمادات۔ نباتات
وغیرہ سے صعود کیا ہے۔ وہ اپنے اس دور ہستی کو
پُورا کرکے پھر واپس آجاتا ہے۔ اُسے آواگون کے
چکر سے نجات نہیں۔ وہ اس دور زندگی میں کچھ ترقی
کرلیتا ہے۔ لیکن جب اُسکی یہ ہستی ختم ہوتی ہے تو پھر
اسی دنیا میں واپس آجاتا ہے۔ الغرض اُس کی
ترقی یہیں تک محدود ہے۔ یہ قیاس ہر ذرہ کائنات
کی روش کے خلاف ہے۔ ہر ایک چیز کا قدم تو آگے کو
ہے۔ لیکن انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی
پر یہ قاعدۂ ترقی حاوی نہیں۔ یہ امر صحیح ہے کہ انسان
میں جو لاتعداد جوہر مخفی ہیں۔ وہ سب کے سب اس
ارضی ہستی میں ظاہر نہیں ہوتے۔ ہر ایک شخص مہندس
شاعر۔ حکیم۔ فلسفی۔ مُدبّر۔ مُصوّر۔ صنّاع وغیرہ نہیں
ہوسکتا۔ ہر ایک شخص اخلاق فاضلہ اور روحانیات کا

مالک نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ سب کی سب باتیں ہر ایک کی جوہرِ فطرت میں موجود ہیں۔ اور فطرت اُن کا نشوونما چاہتی ہے۔ لہٰذا ان قوائے ودیعت کردہ کی بلوغت اور اُن کا ظہور لازماً دو باتیں چاہتا ہے۔ یا تو انسان کی راہ ترقی میں ارضی ہستی کے بعد ایک اور عالم یا سلسلۂ عالمین ہو جس میں موت کے بعد انسان داخل ہو کر اپنی استعدادوں کو کمال تک پہنچالے۔ یا مرنے کے بعد اگر وہ یہاں سے نامکمل حالت میں جائے۔ تو پھر اسی دُنیا میں واپس آکر اُن کمالات کو حاصل کرے جو مرنے پر اُسے حاصل نہیں ہوئے۔ اہلِ تناسخ نے امر دوم کو اختیار کیا ہے۔ لیکن اسلام نے ان دو امور میں سے پہلی بات کو تعلیم کیا۔ قرآن نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ کہ انسان کے اندر لاتعداد قوتیں ہیں جن کا ظہور بتدریج مختلف منازل یا عالموں میں ہوتا ہے وہ اس عالم ارضی میں بہت سی منزلیں طے کر کے آیا ہے۔ مختلف قالبوں میں سے گذر کر اُس نے یہ موجودہ انسانی ہیئت اختیار کی ہے۔ اِن منازل ترقی میں سے جب کبھی وہ کسی منزل میں داخل ہوتا ہے تو اس سے غرض یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ اُس منزل میں

آنیوالی منزل کی ترقیات حاصل کرنے کی استعداد اپنے میں
پیدا کرلے۔ مثلاً اُس کی ترقی کی منازل مختلفہ میں سے
ایک منزل عالم رحم ہے۔ اس عالم میں وہ بشکل نطفہ
داخل ہوتا ہے۔ جہاں وہ گوشت۔ پوست۔ ہڈیاں
اور مختلف اعضاء و جوارح اور پھر قوتِ مُدرکہ کو
اُس کی ابتدائی شکل میں حاصل کرلیتا ہے۔ عالم رحم
میں چند دن گذارنے کی غرض یہی ہے۔ کہ جو ترقیات
اس نے اس زندگی میں حاصل کرنی ہیں۔ اُن کے لئے
ضروری ساز و سامان وہ عالم رحم میں حاصل کرلے۔
نطفے کی شکل میں تو وہ سارے کے سارے
کمالات موجود ہیں۔ لیکن اُس قطرہ پانی میں اُن میں
پر کے وابستہ کمالات کے ظہور کی استعداد اُسی وقت
پیدا ہوتی ہے۔ جب اس نُطفہ میں سے گوشت۔ پوست
مُدرکہ وغیرہ باہر نکل آئیں۔ یہاں کے کمالات ظہور
ایک خاص جسم و مُدرکہ چاہتا ہے۔ اُن کے حصول کیلئے
اُس نے رحمی قالب اختیار کیا۔ یہ دُنیا بھی در اصل
ایک بڑا رحم ہے۔ انسان ماں کے پیٹ سے نکل کر
مادرِ دُنیا کے رحم میں آجاتا ہے۔ رحم مادر میں بالخصوص
جو نئی بات اس نے حاصل کی۔ وہ اس کا وہ مدرکہ یا نفس ناطقہ

ہے۔ جسمیں ابتداءً کُل حیوانی جذبات موجود ہوتے ہیں۔ ان جذبات ردیہ کو اُس نے عمدہ اخلاق اور روحانیات میں متشکل کرنا ہوتا ہے۔ جس کے حصول پر اُس نے وہ لا انتہا ترقیات کرنی ہے جسے اسلامی اصطلاح میں بہشت کہا گیا ہے +

انسان رحم دنیا میں صرف جسمانی ترقی کرنے نہیں آیا۔ یہ ترقی تو وہ عالم شباب تک پہنچنے میں حاصل کر لیتا ہے اگر اس دنیا میں آنے کی غرض صرف جسمانی ترقی ہوتی تو ضرور تھا۔ کہ ہر بچہ جوان ہو کر مر جاتا۔ کیونکہ ہر ایک چیز مقررہ ترقی پا کر فنا ہو جاتی ہے۔ انسان تو مُدرکۂ انسانی میں وہ استعدادیں پیدا کرنے آیا ہے۔ اور اُس سازوسامان کو لینے آیا ہے۔ جو عالم بعد الموت میں اُسکی آیندہ ترقیات کیلئے ضروری ہیں۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے۔ کہ انسان اپنے سفر ترقی پر جس منزل میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں وہ آنیوالی منزل میں کامیاب ہونے کے لئے ضروری اسباب کو مہیا کرتا ہے۔ ایک منزل کی کامل ترقی آنیوالی منزل کی ابتدا ہوتی ہے جس طرح لاتعداد منازل طے کر کے ہم نے اس دنیا کا انسانی جامہ پہنا۔ اسی طرح موت کے بعد جس سے مُراد

دراصل ایک منزل سے دوسری منزل کا انتقال ہے
ہمارے آگے لاتعداد منازل ہیں - ہر ایک منزل میں
ترقی کے سات مدارج ہوتے ہیں - یہی سات مدارج
قرآن کی سات جنتیں ہیں - قرآن انسان کی بعدالموت
ترقیات کو ان سات جنتوں تک محدود نہیں رکھتا
بلکہ اس کے بعد بھی ترقیات کا دروازہ کھلا ہؤا ہے
اس مضمون پر حسب ضرورت آگے چل کر کچھ
لکھوں گا - یہاں مجھے اسی قدر لکھنا ہے
کہ جس طرح لاتعداد قالبوں میں سے گذرتے
ہُوئے ہم نے انسانی شکل اختیار کی - اسی طرح
آگے بھی لاتعداد منزلوں میں سے ہمیں گذرنا
ہے - لیکن ایک منزل کا دور ختم کرنے پر ہم
پھر طے کردہ منزل کی طرف واپس نہیں
آجاتے - بلکہ آگے ہی آگے جاتے ہیں - انہی
سابقہ عالموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی
نے یہ کہا ؎

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
نہ صد و ہفتاد قالب دیدہ ام

جناب کرشن نے اگر ارجن کو یہ کہا - کہ میں اپنے پچھلے

جنموں سے واقف ہوں تو اس سے یہ مُراد نہیں کہ وہ بار بار اس دُنیا میں پیدا ہُوئے۔ بلکہ اُس صاحبِ عرفان نے ان مختلف جنموں کا ذکر کیا۔ جن میں سے اُنھوں نے زمینی عالم سے پہلے کے صدہا عالموں میں گذر کیا۔ ارجن کے زمانہ کے لوگ اور ایسا ہی اُنکے بعد کی کئی ایک نسلیں تو ان عالموں سے واقف تھیں جنھیں علوم جدید والے عام طور پر جانتے ہیں۔ اسلئے اُن کا اسبات سے مسئلہ تناسخ مستنبط کرنا ایک طبعی بات ہے، ایتھر کے ذرّات جسے، آج کائنات کی ابتدائی شکل تسلیم کیا ہے۔ آخر کار ایک خاص ہیولے میں جمع ہو کر انسان بن جاتے ہیں۔ ایتھر کے ذرّات انسانی ہستی تک پہنچنے میں لکھوکھا برس لے لیتے ہیں۔ لیکن وہ نبیولا کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ کبھی وہ برقی ذرّات بن جاتے ہیں۔ کبھی اُن کا نام اٹم ہو جاتا ہے۔ کبھی عنصر اُنکے بعد صدہا منظم اور غیر منظم صورتیں پیدا ہو جاتے ہیں۔ عالم منظمّ میں جوہر حیات پیدا ہوتا ہے۔ جو آخر کار عالم حیوانات میں خاتمہ دماغ پیدا کر کے انسان کے وجود کی تکمیل کرتا ہے۔ الغرض ایتھر کے ذرّات مختلف عالموں میں جنم لیتے ہوئے آخر کار

انسان ہو جاتے ہیں - یہی وہ قالب ہیں جن کی تعداد
ایک مسلم صوفی نوسو ستر گن رہا ہے - یہی وہ جنم ہیں
جن کی طرف عارف باللہ کرشن اشارہ کر رہا ہے - انھیں
جنموں اور قالبوں کو قرآن نے لفظ عالم سے تعبیر
کیا - اور اس لئے کتاب حمید کو خدا کی صفت
ربّ العلمین سے شروع کیا - اور اسی ایک جملہ
میں ضرورت قرآن کا بھی ذکر کر دیا - یعنے جس طرح
ہمارے رب نے ہر عالم میں انسان کی ترقی اور نشوونما
کے اسباب ہر عالم کے حسب حال پیدا کیئے - وہی
رب العلمین انسان کو اس عالم میں لاکر اُسے ایک
ایسی ترقی کے لئے تیار کرتا ہے - جس کا تعلق
ذہنیات اور ادراک سے ہے - اسلئے ضروری ہے
کہ ادراک و ذہن کی ربوبیت کے لئے وہ کوئی ایسی
چیز پیدا کرے - جسے ذہن اور ادراک سے تعلق
ہو - یعنے ہدایات ؛

تکمیل نقص کیلئے اس دنیا میں واپس آنے کی ضرورت نہیں

یہ سچ ہے کہ سارے کے سارے انسان اس دنیا میں آکر
اس دنیا کی وابستہ ترقی کو حاصل نہیں کر سکتے یا بالفاظ دیگر

اس سازو سامان کو اس دُنیا سے لے کر نہیں جاتے۔ جو اُن کی آیندہ ترقی کے لئے ضروری ہے۔ اور جس توشہ کے لئے وہ یہاں آئے تھے۔ اس لئے لازم ہے۔ کہ یا تو ان نقصوں کی تکمیل کسی ذریعہ سے آئندہ عالم میں ہو جائے جیسے کہ اسلام تعلیم کرتا ہے۔ اور اُس ذریعہ کا نام قرآنی اصطلاح میں جہنم قرار دیا گیا ہے۔ یا اُن نقصوں کے دفعیہ کے لئے انسان یہاں پھر آئے۔ جیسے اہل تناسخ عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور اس امر کو تھیاسوفسٹ تناسخ کے ثبوت میں بطورِ دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ جب اِس دُنیا کی ترقیات اس دُنیا کی بعض چیزوں سے وابستہ ہیں۔ اور وہ چیزیں عالم بعد الموت میں نہیں۔ تو پھر وہ ترقیات کس طرح وہاں ہو سکتی ہیں۔ لازم ہے۔ کہ اُن چیزوں سے متمتع ہونے کے لئے پھر انسان یہیں واپس آئے۔ بات تو صاف ہے۔ لیکن جن مسلمات پر یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ اگر تو اس دُنیا کے اسباب کے علاوہ آنیوالی دُنیا میں دفع نقص کے

اور اسباب نہوں تو لازم ہے۔ کہ ناقص انسان مرنے کے بعد یہیں واپس آئے۔ اور اگر آنیوالی دُنیا میں کوئی ایسے بھی نئے اسباب ہوں جو اس دُنیا کے اسباب سے تو مختلف ہوں۔ لیکن اس دُنیا کے نقصوں کے دفعیہ کے لئے یہاں کے اسباب سے کہیں زیادہ مُوثر اور مفید ہوں تو پھر اس دُنیا میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس امر کے طے کرنے کے لئے کہ آنیوالی دُنیا میں دفعیہ نقص کے اسباب موجود ہیں۔ یا کہ اس دُنیا کے نقصونکے دفعیہ کے لئے ہمیں لازماً اسی دُنیا میں واپس آنا ہے مجھے ایک ہی راستہ سمجھ آتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس دُنیا مشہودات میں بھی ترقی کا دور چل رہا ہے۔ اور اِس دُنیا میں بھی مختلف عالم موجُود ہیں جنمیں سے اشیائے عالم یکے بعد دیگرے گذرتی ہُوئی نظر آتی ہیں۔ ایک منزل سے نکل کر دوسری منزل میں بغرض نشو ونما چیزیں چلی جاتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ اگر کوئی چیز ناقص حالت میں ایک منزل کو چھوڑ کر دوسری منزل میں چلی جاتی ہے۔ تو کیا وہ چیز تکمیل نقص کے لئے چھوڑی ہُوئی منزل کو واپس جاتی ہے۔ یا نئے عالم میں کسی اور طریق پر اس کے نقص درست کئے جاتے ہیں +

ایک بیج کا درخت کئی منازل میں سے گذر کر پھل بنتا ہے۔ اُس کے درخت کا تنہ بطور ایک رحم مادر کے ہے۔ پھلوں کی ایک غرض یہ بھی ہے۔ کہ وہ انسان کی خوراک یا دوائیں۔ سیب درخت کے تنہ میں سے نکلتا ہے۔ سب قسم کے سیب اچھے بُرے۔ پُختہ کچے بازار میں آکر خوراک انسانی بن جاتے ہیں کیا کسی ناقص سیب کو پھر سیب کے تنہ میں داخل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ خوراک انسانی کے قابل نہیں یا اُس سیب کو یا در پچخانہ میں بھیج کر آگ کے ذریعہ پُختگی کی حالت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ جن سیبوں کو درخت کے تنے نے پُختہ کر دیا ہے۔ وہ نہیں پکائے جاتے۔ اپنی پُختگی کے لئے جس حرارت کی اُنھیں ضرورت تھی۔ وہ اُنھوں نے درخت پر بیٹھے ہوئے ہی حاصل کر لی۔ لیکن جو سیب اُس حرارت کو حاصل نہ کر سکے۔ اور درخت سے کچے ہی اُتر آئے اُنھیں ہمارے آتش دان میں وہ حرارت دیدیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ اگر کچے پھلوں کے پختہ ہونے کے لئے اُنھیں درخت کے تنہ میں داخل ہونا ضروری ہے۔ تو اہل تناسخ کا مذکورہ بالا نظریہ

صحیح ہے۔ لیکن اگر یہ نقص عالم درخت کے بعد باورچیخانہ کے عالم میں یا کسی اَور طریق پر رفع ہو سکتے ہیں تو بالبداہت یہ قیاس غلط ہے۔ بلکہ بعض پھل تو اپنی بہترین خوبیاں اسی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ کہ وہ کچا پن کی حالت میں درختوں سے اُتارے جاکر پال کے ذریعہ پختگی حاصل کریں۔ انگور۔سیب۔ آم وغیرہ کی یہی کیفیت ہے۔ یہ وہ بچے ہیں۔ جو کم عمری ہی میں فوت ہو کر دوسری دُنیا کو چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اہل تناسخ کی طرف سے یہ بھی اعتراض ہؤا ہے۔ کہ جو بچے پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ وہ کیوں یہاں آئے اس بات کی تشریح میں آگے چل کر کروں گا۔ لیکن یہاں اسی قدر لکھ دینا کافی ہے۔ کہ اگر پال کا انگور یا آم درخت پر پکے ہوئے آم اور انگور سے ذائقہ اور خواص میں کہیں بہتر ہے۔ تو جو بچے پیدا ہوتے ہی موت کے آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ وہ آئندہ دنیا میں ہم سے بدرجہا بہتر ترقی کے اہل ہو سکتے ہیں +

اب کائنات کی اور چیزوں کو چھوڑ کر میں

انسان کی پیدائش پر آ جاتا ہوں ۔ یہی مختلف قسم کی خوراکیں جو ہمارے دستر خوان پر آ جاتی ہیں ۔ معدے ۔ جگر ۔ دل سے ہوتی ہوئی ایک عمدہ خون صالح بن جاتی ہیں ۔ اسی خون صالح میں سے نطفہ پیدا ہوتا ہے ۔ جو عورت کے رحم میں ایک خاص پرورش کے بعد انسانی بچہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ اشیاء خوردنی ان مختلف عالموں میں غیر پختہ حالتوں میں جا سکتی ہیں یا نہیں ! اور اگر ایک عالم کی متعلقہ پختگی کو حاصل کرنے کے بغیر وہ آیندہ عالم میں جاتی ہیں ۔ تو اُن کا نقص اس آیندہ عالم میں ہی دفع کیا جاتا ہے ۔ یا دفع نقص کے لئے وہ سابقہ عالم میں واپس آتی ہیں ۔ یہ تو ضروری ہے ۔ کہ معدہ میں جو چیز جائے ۔ وہ پختنہ حالت میں ہی جائے ۔ کچی خوراکیں بھی ہم کھا لیتے ہیں ۔ وہ معدے کی تکلیف کا باعث ہو جاتی ہیں ۔ درد معدہ یا کوئی اور تکلیف اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ کہ خوراک ناقص حالت میں باور چیخانہ کے عالم سے نکل کر عالم معدہ میں پہنچی ہے ان نقصوں کو مختلف ادویات سے ہی دفع کر دیا جاتا ہے ۔ اس کا یہ تو علاج نہیں کہ ہم قے کریں ۔

اور تے شدہ چیز کو درست کر کے پھر معدہ میں لائیں بعض وقت خود اس کی غیر پختگی نا قابل محسوس ہوتی ہے جس سے اچھا کیلوس کیموس نہیں بنتا۔ اسی سے امراض جگر پیدا ہوتے ہیں۔ جگر کی اصلاح کی جو ادویات اطباء نے تجویز کی ہیں۔ اُن سے کیلوس۔ کیموس صحیح حالت میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد وہی اشیاء خوردنی خون کا قالب اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسے پھیپھڑے اور دل کو تعلق ہوتا ہے۔ بعض کا خون صالح نہیں ہوتا کمزور ہوتا ہے۔ خون ناقص کو اصلاح کے لئے جگر کے عالم میں واپس نہیں بھیجا جاتا بلکہ دل اور پھیپھڑوں میں خون کا ہیر پھیر ہوتا رہتا ہے۔ ہاں اُس کی اصلاح کے لئے فولاد کے بعض مُرکبات معدے کے ذریعہ عالم خون میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ جس سے خون اصلاح پا لیتا ہے۔ اسی طرح نطفہ کی کمزوری کی اصلاح کے لئے نطفہ کو پھر عالم خون میں واپس نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ثعلب مصری موصلی۔ بہمنیں۔ شقاقل وغیرہ سے نطفہ کو حالت صحت میں لایا جاتا ہے۔ آخر منزل پر اگر نطفہ ناقص رحم میں جائے۔ تو وہاں کے نقص بھی

اُن ادویات سے ہوتے ہیں۔ جن کا براہِ راست تعلّق رحم سے ہوتا ہے۔ بعض بچّے بعض نقص لے کر رحم مادر سے باہر آتے ہیں۔ چنانچہ ایسے بچے بھی دیکھے گئے ہیں۔ جن کے بعض سوراخ بند ہوتے ہیں۔ مثلاً فضلے کے اخراج کا راستہ مسدود ہوتا ہے۔ سرجن کا چاقو اس نقص کی اصلاح کر دیتا ہے۔ اگر تو اطبّا کے تجربے اور مشاہدے نے بچّوں کی پیدائش پر اُن کے بعض نقصوں کا علاج یہی تجویز کیا ہُوا ہے۔ کہ یہ بچّے رحم مادر میں واپس جائیں۔ تو اہل تناسخ کا یہ نظریّہ بالکل قابل عزّت ہے۔ اور اگر صحیح اور مرعی طریق یہی ہے۔ کہ جس حالت میں بچّے اس عالم میں آئیں۔ اُن کے نقصوں کا دفعیّہ یہیں کیا جائے۔ تو پھر جن نقصوں کو لے کر ہم اس عالم یا رحم دُنیا سے لے کر آگے جائیں گے۔ اُن کا دفعیّہ بھی وہیں ہو جائیگا۔ اس میں شک نہیں کہ کسی گذشتہ عالم کے نقصوں کا دفعیّہ جب اس کے بعد کے عالم میں ہوتا ہے۔ تو وہ بہت ساری تکالیف کا مُوجب ہوتا ہے۔ علاج کے لئے ادویات تلخ وغیر مرغوب ہی دی جاتی ہیں

سرجن کی نشتر اور جراحی عمل کوئی خوشگوار چیزیں نہیں ۔ بلکہ بہت ہی تکلیف افزا ہیں ۔ لیکن نقص کے دُور کرنے کے لئے ان تکالیف کو سہنا ہی ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ عذاب دوزخ بھی بہت تکلیف دہ ہوگا ۔ لیکن یہ عذاب اصلاح نفس کیلئے ضروری ہے +

بچّوں کا پیدا ہوتے ہی مرجانا ضرورتِ تناسخ پر دلالت نہیں کرتا

یہاں میں اس اعتراض کا کسی قدر وضاحت سے جواب دیتا ہوں ۔ جو بچّے کے پیدا ہوتے ہی یا صغرسنی یا حالت شیر خوارگی میں فوت ہونے کے متعلق کیا جاتا ہے کہ ایسے بچّوں کے اس دنیا میں آنے کا کیا فائدہ ہے ۔ قرآن کریم کی بعض آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اس دُنیا میں آنے کی غرض پیدائش نفس ناطقہ اور اُس کی بلوغت ہے ۔ یوُں تو عالم نطفہ میں ہی اُس کی کُل کی کُل ترقیات بالقوہ موجُود ہوتی ہیں ۔ لیکن اس دنیا کی ترقی بعض گوشت پوست و

اور اک کو چاہتی ہے ۔ ان چیزوں کے حصول کیلئے نطفہ رحم مادر میں جاتا ہے ۔ جسم کی تکمیل پر اسمیں ایک چیز نئی پیدا ہوتی ہے ۔ جسے مدرکہ کہتے ہیں اس مدرکہ کے بغیر آیندہ کی ترقی ناممکن ہے ۔

یہ جو حیوانات اور نباتات کے جسموں میں ایک قسم کی تنظیم واقع ہوتی ہے ۔ یعنے وہ ہمیشہ ایک ہی شکل پر واقعہ ہوتی ہے ۔ یہ در اصل اس جوہر حیات کا نتیجہ ہے جو سب سے پہلے عالم نباتات میں پیدا ہوتا ہے لیکن جہاں نباتات ایک ہی مقام پر کھڑے رہکر اپنی ضروریات کو اپنے ماحول سے حاصل کر لیتے ہیں وہاں حیوانات میں ایک اور چیز ہے ۔ جو انھیں اُن کی احتیاجوں کے دفعیہ کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے آتی ہے حیوانوں میں بھوک و پیاس اور بعض دیگر خواہشات کا احساس اس قدر تیز کر دیا گیا ہے ۔ کہ ان اشتہاؤں کے مشتعل ہونے پر وہ ایک جگہ ٹھیر نہیں سکتے ۔ اور ان کے دفعیہ کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں ۔ ان اشتہاؤں کا احساس ہی ان کے سکون کو حرکت کا موجب ہوتا ہے ۔ ان اشتہاؤں کے احساس اور ان کے دفعیہ کی ضرورت کے احساس کا نام عربی زبان نے مدرکہ تجویز کیا ہے ۔ جسے ہم اس بحث

ہیں مدرکہ حیوانی سے تعبیر کرینگے۔ یا مُدرکہ در اصل کُل
کُل کے حیوانی جذبات کے مجموعہ کا نام ہے۔
انسان میں بھی یہ مُدرکہ ہے۔ اُس کی حرکات و سکنات
کا موجب بھی یہی مُدرکۂ حیوانی ہے۔ لیکن حیوانی مُدرکہ
اور انسانی مُدرکہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔
حیوانی مُدرکہ جس رنگ میں واقع ہو۔ اس میں کمی
بیشی واقع نہیں ہوتی۔ لیکن انسانی مُدرکہ
تہذیب و تعدیل میں آسکتا ہے۔ مثلاً حیوان
کے جذبات مشتعل ہونے پر علی العموم کسی قسم کی
تمیز یا لحاظ نہیں کرتے۔ لیکن مدرکہ انسانی جذبات
کے مشتعل ہوتے پر اگر کسی قدر بھی نا تہذیب یافتہ
ہو تو صبر و استقامت سے جذبۂ مشتعلہ کا مقابلہ
کر سکتا ہے۔ یعنی مُدرکہ انسانی میں یہ اہلیت خدا تعالیٰ
نے رکھی ہے۔ کہ اُس کے کُل کے کُل جذبات فاسدہ
تہذیب پاکر معمولی اخلاق پھر اخلاق فاضلہ اور
رُوحانیت بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جہاں مختلف
حیوانات میں ایک نہ ایک جذبہ نہایت تیز ہوتا ہے
جسمیں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ وہاں انسان میں کل
حیوانی جذبات تو موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اعتدال میں

آ سکتے ہیں مثلاً گائے میں حلم۔ اُونٹ میں کینہ۔ چیتے میں مکّاری۔ شیر میں تہوّر۔ مُرغ میں شجاعت۔ سُؤر میں دیّوثی بیغیرتی شہوت اور گندہ خوری۔ بچھڑے میں مُتکسر المزاجی۔ بلّی میں صفائی۔ گدھے میں بُردباری یہ حیوانی جذبات بصورت اتم ان حیوانات میں الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور کمی بیشی نہیں پاتے۔ لیکن انسان میں یہ ساری باتیں ہوتی ہیں جو گھٹ بڑھ سکتی ہیں۔ اور اعتدال بھی پالیتی ہیں۔ یہی دراصل انسانی حیوانی مُدرکہ کے اجزا ہیں۔ حیوانوں میں الگ الگ ایک آدھ جذبہ تو بحد کمال ہوتا ہے۔ جو آناً فآناً ظاہر ہو جاتا ہے۔ باقی جذبات بہت کم ہوتے ہیں۔ اور ان کا اظہار بھی سخت ضرورت پر ہی ہوتا ہے۔ لیکن انسان میں یہ سب کے سب جذبات ایک ہی استعداد کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی جذبہ حیوانوں کی طرح بحد کمال پہنچنے کی بھی استعداد رکھتا ہے۔ اور دوسرا مقابل کا جذبہ قطعاً معدوم بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن انسان کامل وہی ہے۔ جسمیں یہ کل کے کُل اجزا تعدیل میں آکر حسب ضرورت ظاہر ہوں اُن کی تعدیل کا نام ہی اخلاق اور رُوحانیت ہے

بعض انسان کسی جذبہ میں اُس حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ جو حد کسی خاص حیوان سے مختص ہوتی ہے۔ مثلاً غُصّہ میں شُتر کینہ ور ہو جاتے ہیں۔ یا اپنی بے غیرتی اور گندہ خوری میں سُؤر کی عادات حاصل کر لیتے ہیں۔ یا اسی طرح اُن میں کوئی اور جذبہ اتنا تیز ہوتا ہے۔ کہ اُس سے ملتا جُلتا رنگ کسی حیوان میں ہی پایا جاتا ہے۔ ایسے اشخاص گو بظاہر انسانی جامے میں ہوتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ حیوان بشکل انسان ہوتے ہیں۔ جو غُصّہ کو دبانا نہیں جانتا یا جس کا غُصّہ مہینوں یا برسوں ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ وہ دراصل انسانی جامے میں شُتر ہے۔ یہ جو بعض صُوفی کہتے ہیں کہ بعض انسان ہمیں کشفی نگاہ میں مختلف جانوروں کی صورت اختیار کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُنکی حقیقت یہی ہے۔ کہ جس حیوان کا مُدرکہ جس انسان میں پیدا ہو گیا۔ وہ اہل کشف کو اُسی حیوان کی شکل میں نظر آ جاتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے۔ کہ انسان جس قسم کے مُدرکہ کو لے کر اس دُنیا سے رُخصت ہوتا ہے اُس کا حشر بھی اُسی مُدرکہ میں ہوتا ہے۔ یعنے حشر کے وقت بعض انسان سُؤر بعض انسان کُتّے بعض

انسان کوئی اور حیوان اور اگا ہوتے ہیں۔ اس سے یہ مُراد نہیں۔ کہ وہ فی الحقیقت مرنے کے بعد بھی جانور بن جاتے ہیں۔ بلکہ اس عالم میں جن اشیائے جسم نے تیار ہوتا ہے۔ اُس کے اندر اُس حیوان کا مُدرکہ ہوتا ہے۔ اور یہ کیا عجب بات ہے۔ جب اس دُنیا میں بعض انسانوں کے اندر بعض حیوانات کا مُدرکہ غالب ہوتا ہے۔ تو آیندہ بھی ہو سکتا ہے یہی حقیقت ہندوستان کے کسی بزرگ رشی پر کھلی ہو گی۔ جس کی حقیقت سے ناآشنائی نے اہل تناسخ کی کتابوں میں یہ لکھا دیا۔ کہ بعض انسان دوسرے جنم میں بعض حیوانات کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے بھی انسان دیکھے ہیں۔ جن کے قفس نفس میں تین چار جانور نظر آتے ہیں۔ مثلاً بلّی کی طرح اگر وہ از حد صفائی پسند ہیں۔ تو سؤر کی طرح بلا نوش شہوت ران اور بے غیرت بھی ہوتے ہیں ایسا ہی کتے کی طرح جو چیز اُن کے قبضہ میں آجائے اُسے نہیں چھوڑ سکتے۔ اب کیا یہ مختلف جانور ایک شکل انسانی میں جمع نہیں ہو گئے۔ یہی حالت عالمِ اُخروی کی ہے۔ ایسے لوگ جن ذرّات کا جسم اختیار

کرینگے - اُن کا نام تو انسان ہی ہوگا - لیکن اُن میں مُدرکہ حیوانی ہوگا +

حیوانی اور انسانی جسم کی کیمیاوی تحلیل و تفرید نے ثابت کردیا ہے - کہ انسانی حیوانی جسم کے اجزا دراصل ایک ہی ہیں - لیکن ان اجزا سے مختلفہ کی کمی بیشی ہی مختلف حیوان اور اُن کی مختلف شکلیں اور اُن کے مختلف اعضا و اطوار پیدا کردیتی ہیں سُؤر کے جسم کے اجزا ایسا ہی کُتّے - مُرغی اور انسان کے جسم کے اجزا تو ایک ہی ہیں - لیکن بعض اجزا بعض میں کم ہیں بعض میں زیادہ اس کمی بیشی نے ہی مختلف گوشت پوست مختلف شکلیں مختلف جذبات اور مختلف وضعیں اور اخلاق پیدا کردیئے ہیں - انسان میں یہ سب کے سب اجزا ایک خاص تناسب میں موجود ہوتے ہیں - انھیں متناسبہ اجزا سے اُس کا جسم ایک خاص وضع میں اور اس جسمی وضع کے لحاظ سے اس میں جذبات کی خاص کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اب اگر مختلف حیوانات کے جذبات انھی اجزا کے مختلف مقدار کی ترکیب کا نتیجہ ہے - جس سے اُن کا گوشت پوست پیدا ہوکر ان میں مختلف مدرکے پیدا کردیتا ہے

تو جس جانور کا بھی ہم گوشت کھائیں گے ہمارے جسم میں اُس جانور کے اجزا کی زیادتی ہو جائیگی۔ اب اگر اس زیادتی کا نتیجہ ہی اُس حیوان کا مُدرکہ خاصہ ہے۔ تو یہ عجب نہیں کہ اُس جانور کے اخلاق اُس کے گوشت کھانے پر کسی انسان میں پیدا ہو جائیں۔ اگر اُونٹ کا گوشت رات دن کھانے والے خطرناک غصیلے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے تو سُؤر کا گوشت کھانے والے کیوں بیحیا اور دیّوث نہ ہوں۔ اس لئے شریعت نے بعض جانوروں کے گوشت قطعاً بند کر دیئے۔ اور بعض جانوروں کے گوشت احتیاط سے کھانے کی ہدایت فرمائی۔ اور ساتھ ہی بقولات وغیرہ پر بھی زور دیا جس سے لحمی نفس اصلاح پالیں۔ انسانی نفس دراصل ایک چڑیا خانہ ہے۔ ان میں سب کے سب جانور بند ہیں۔ صحیح المزاج یا مُہذّب انسان ایک چڑیا گھر کے ایک داروغہ کی طرح ہے۔ جو سب جانوروں کو محفوظ اور محدود کر کے جس جانور سے چاہے وقت پر خدمت لیلیتا ہے۔ وہ ان خدمات کے محل اور موقع کو جانتا ہے۔ لیکن ایک غیر مہذّب انسان کسی نہ کسی جذبہ کا شکار ہو کر خود

چڑیا خانہ کا کوئی جانور بن جاتا ہے ٭
الغرض مُدرکۂ حیوانی اور مُدرکۂ انسانی میں فرق اسی قدر ہے۔ کہ مدرکہ حیوانی تہذیب و تعدیل نہیں پا سکتا۔ لیکن مُدرکۂ انسانی تہذیب و تعدیل پا سکتا ہے۔ اس مُدرکہ کا ظہور رحم مادر میں ہوتا ہے۔ جس وقت کوئی بچہ رحم مادر میں سے نکلتا ہے۔ تو وہ اُس مُدرکہ کو لے کر نکلتا ہے۔ اب اسمیں ترقی کی استعداد پیدا ہو چکی ہے۔ اس عالم دنیا میں اس مُدرکۂ انسانی نے تعدیل و تہذیب پاکر آیندہ ترقی کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ ترقی موت کے بعد ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بچہ پیدا ہوتے ہی مر جائے تو اُس میں ترقی کرنے کی استعداد تو پیدا ہو چکی ہے وہ اس چیز کو یہاں سے لے کر چلا ہے۔ کہ جس کے بغیر عالم بعد الموت میں ترقی ناممکن تھی۔ اور وہ چیز اُسی عالم رحم میں سے گذر کر یہاں آتے پر حاصل ہوئی تھی۔ اب خواہ وہ یہاں آکر ایک دن کے لئے بھی نہ جیئے مقصد اصلی اپنی ابتدائی شکل میں حاصل ہو چکا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُس کے مُدرکہ نے تہذیب و تعدیل نہیں پائی۔ لیکن بہت سے

دوسرے انسانوں کی طرح اُس کا مُدرکہ کسی حیوان کا مُدرکہ بھی نہیں بن گیا۔ نہ اُسمیں افراط تفریط آئی ہے مُدرکۂ انسانی موت کے بعد تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک تو وہ ہے جسکے جذبات تہذیب و تعدیل پا چکے ہیں۔ دوسرے وہ جن میں افراط تفریط کا رنگ پیدا ہوگیا۔ اور وہ اپنی موت پر حیوان بشکل انسان تھے۔ تیسرے وہ جن میں نہ ترقی ہوئی نہ تنزل چھوٹی عمر میں مرا ہوا بچہ اگر تعدیل شدہ حالت میں اپنے جذبات نہیں لیگیا تو افراط تفریط کی حالت سے ہی بچا ہُوا گیا۔ اس لئے ایک ایسے عالم میں جہاں افراط و تفریط کی تحریکات نہیں اُس کا بہت جلد پرورش پاکر جادۂ اعتدال پر آجاتا اُن مُدرکات انسانی سے آسان تر ہے جو افراط اور تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم اس دُنیا میں آتے ہیں۔ تو ہمیں ایک سفید چادر دی جاتی ہے۔ جس پر یہاں ہمیں صرف پنسل کے کچھ نقش کرنے ہیں۔ اور تصویر کا ڈھانچ تیار کرنا ہے جس پر رنگ و روغن حیات بعد الموت میں چڑھایا جائیگا اور تصویر کی کامل شکل وہاں ہی پیدا ہوتی ہے۔

بہت تھوڑے انسان ہیں - جن کی چادر پر صحیح پنسلی نقش ڈالے گئے ہیں - کثرت سے جو چادریں جاتی ہیں یہاں کے غلط نقش و نگار نے ان کی ہیئت کو ہی بدل دیا ہوتا ہے - انھیں اس قدر گندہ اور چرک کر دیا جاتا ہے - کہ نہ صرف نقش اول ہی بگڑا ہوتا ہے - بلکہ اس کی گندہ حالت اس قابل ہی نہیں - کہ اس پر از سر نو نقش پیدا ہو سکیں - اور نیز وہاں کا رنگ و روغن چڑھ سکے - اس چادر کو دھویا ہی جائیگا - اور جو بہت گندی ہوگی تو کسی قسم کے تیزاب سے اس کا چرک پن دور کیا جائے گا اور چادر کو پھر اس حالت میں رکھا جائے گا - جس پر پنسلی نشان تک بھی نہ ہو - اور پھر اس پر پنسل کے نشان دے کر اسے رنگ و روغن چڑھایا جائے - اب وہ بچہ جو سفید چادر کو ہی لے کر دنیا سے رخصت ہو گیا - وہ بدرجہا بہتر ان انسانوں سے ہے - جو چادر کو چرک شدہ حالت ہی میں لے گئے ہیں - دوزخ در اصل وہی سوڈا یا تیزاب یا دھوبی کی بھٹی یا دھوبی کے تختے پر کپڑے کا مارا جاتا یا نچوڑ کے پیچ میں آنا یا استری کے تلے جلنے

کی مختلف کیفیات ہیں۔ جن سے انسانی مُدرکہ کی چادر نئے از سر نو پاکیزہ ہوتا ہے۔ ان مصائب کے بعد جب ایک گنہگار کی چادر نئے اُسی حالت کو پھر اختیار کرتا ہے۔ جو اس بچے کی چادر کی ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ تو پھر کیوں کہا جائے۔ کہ اُس بچے کا پیدا ہونا بیکار گیا ہ

ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

حیات بعد الموت کی ترقیات کیلئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مدرکہ انسانی انسانی جسم میں آئے۔ اور وہ نہیں ہو سکتا جب تک رحم مادر میں اُس کا مقام نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ جب وہ جسم انسانی میں آئے۔ تو بذریعہ موت اُسے جسم سے الگ کیا جائے۔ یہ دو نو حالتیں اس بچے پر وارد ہو جاتی ہیں۔ جو پیدا ہوتے ہی یا جان کے پڑ جانے کے بعد رحم میں ہی یا دُنیا میں آکر دو چار گھنٹے یا دن یا ماہ یا سال جی کر مر جاتا ہے۔ ایک بڑا مقصد جس کے لئے انسان اس دُنیا میں آتا ہے۔ یعنے مدرکۂ انسانی کو پیدا کرنا وہ بچہ بھی

حاصل کر لیتا ہے۔

ترقی رُوح کیلئے ضروری نہیں کہ انسان پھر یہاں آئے

اسمیں شک نہیں کہ ربانی اقتصاد نے مُدرکۂ انسانی کی تہذیب و تعدیل کے لئے اس دُنیا کو مقرر کیا۔ اسی دُنیا کی چیزیں اور اسی دنیا کا ماحول انسان کے اخلاق و آداب پر ایک گہرا اثر ڈال دیتا ہے بہت سی باتیں اُس کے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں اسی علم و تجربے سے اُس کے اخلاق اچھے اور بُرے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ نفس مُدرکہ کی مقررہ تہذیب و تعدیل جو اس دُنیا میں ہوتی ہے۔ اُس کے لئے اس دنیا کا ہونا ہی ضروری ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ وہ انسان جو لمبی عمر پاتے ہیں۔ اور ضعیف ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اُس حالت ارذل پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں کُل کا کل حاصل کردہ علم و تجربہ ضائع ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا ہے۔

واللہ خلقکم ثم یتوفکم ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکی لا یعلم بعد علم

شیئاً ان اللہ علیم قدیر (سورۂ نحل آیت ۷۰) اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہاری قبض رُوح کرے گا اور بعض تم میں ایسے بھی ہیں۔ کہ وہ ایسی ارذل عمر پر پہنچ جاتے ہیں۔ کہ جو کچھ بھی اُنہوں نے علم حاصل کیا ہوتا ہے۔ وہ سب کا سب چلا جاتا ہے +

اس حالت میں سینکڑوں آدمی نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے کوئی لمبا چوڑا علم و تجربہ حاصل نہیں کیا ہوتا۔ انمیں ستودہ خصائل اور حمیدہ اخلاق بھی پیدا نہیں ہوئے ہوتے۔ اب مُدرکہ انسانی بھی موجود ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی ہے جنھیں اہلِ تناسخ کمی علم یا نقصِ رُوح کے دفعیہ کے لئے واپس آنا تجویز کرتے ہیں جب اس دنیا میں ہوتے ہوئے اُنھیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ حاصل کردہ علم بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ تو اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو گیا۔ کہ رُوح کی ترقی کیلئے یہ ضروری نہیں کہ یہی دنیا ہو +

بعض اہل تناسخ بعض ہونہار بچوں کو دیکھ کر جن میں علم و عقل کے اکتساب کی طاقت بہت زبردست ہوتی ہے بول اُٹھتے ہیں۔ کہ اس بچے کی یہ قوتیں

پچھلے جنم سے ساتھ آئی ہیں۔ حالانکہ کُل کے کُل انسان اس دنیا میں داخل ہوتے پر ہر ایک علم و تجربے سے کورے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا "واللہ اخرجکم من بطون امھٰتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون (سورۂ نحل آیت ۷۸)" اللہ تعالےٰ تمہیں اس دُنیا میں ماؤں کے رحم سے لاتا ہے۔ جب تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ اُس نے تمہیں کان آنکھ اور دل دیئے۔ لیکن تم شکر نہیں کرتے"۔ وہ ایک ایسا تختہ لے کر آتے ہیں جو سارے کا سارا کورا ہی ہوتا ہے۔ اس کورا پن کو اس بات کی طرف محسوب کرتا کہ ہم سب کا سب پچھلے جنم کا پُورا کردہ علم بھول کر آتے ہیں۔ خُود اس نظریہ تناسخ کی تردید کرتا ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے۔ کہ انسان کو اس دُنیا میں اس لئے بار بار آنا چاہیئے۔ کہ وہ سارے کے سارے تجارب انسانی حاصل کرے۔ یعنے اگر ایک جنم میں آکر سپاہیانہ زندگی بسر کر کے وہ فنونِ سپاہگری حاصل کرے۔ تو پھر دوسرا جنم لے کر وہ مُصوّر یا مہندس یا انجینیر یا شاعر یا جج یا وکیل یا سادھو بنے

چونکہ یہ سارے کے سارے تجربے ایک زندگی میں حاصل نہیں ہوتے۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ وہ بار بار آئے اور جن باتوں کی استعداد اس میں رکھی گئی ہے۔ اور انسان میں تو ہر ایک استعداد ہے۔ وہ سب کی سب باتیں حاصل کرے۔ اور اس آواگون کا چکر اُس تاریخ تک ختم نہ ہو۔ جب تک کہ وہ کل شئے کے کُل علم و تجربے کا مالک نہ ہو جائے۔ بات تو بڑی دلچسپ ہے۔ اور خوبصورت ہے۔ لیکن یہ بات تو تو ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ کہ جب ہم پچھلے جنم میں سپاہگری کے فنون کو تکمیل دے کر مر گئے۔ اور دوسرے جنم میں مصوّری کے فنون سیکھنے کیلئے آئے تو ہم سپاہگری سے بھی طبعاً واقف ہوں۔ اور اسطرح ہر ایک آنے والے جنم میں گذشتہ جنموں کے تجارب اور علم ہمارے مُدرکہ میں مستحضر رہیں۔ لیکن یہ بات تو نظر نہیں آتی۔ پیدائش کے وقت تو کسی قسم کا علم ہم میں نہیں ہوتا۔ اسلئے یہ نظریّہ بالبداہت غلط ہے۔ بعض بچّوں کا فوق العادت ذہین ہونا کسی گذشتہ جنم کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اُن کی تین چار پشتوں کو دیکھ لیا جائے۔ اُن کا دادا یا کوئی

بڑا باپ اعلےٰ درجہ کا ذہین گذرا ہے۔ اور یہ باتیں اُنھوں نے ورثہ میں پائیں +

البتہ یورپ میں بعض عورتیں جو بطورِ فیشن تھیاسوفی میں شریک ہوکر تناسخ کو تسلیم کر لیتی ہیں وہ کچھ اپنے پچھلے جنموں کا بھی حال بتاتی ہیں لیکن اس میں دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ یہ عورتیں اپنے جتنے گذشتہ جنم بتاتی ہیں سب کی سب تاریخی عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ اور پھر اس پر طرہ یہ ہے۔ کہ وہ سب کی سب ہندوستان کی رانیاں اور مہارانیاں ہی ہوتی ہیں۔ کبھی اُنھوں نے کسی گذشتہ جنم میں اپنا افریقہ یا امریکہ میں ہونا نہیں بتلایا۔ جس طرح یورپ کی نگاہ ہندوستان کی دولت پر پڑتی ہے اسی طرح یہ عورتیں بھی پچھلے جنموں میں یہاں کے حکمرانوں کی بیبیاں ہی بننا پسند کرتی ہیں۔ کبھی کبھی بعض مصری تاریخی عورتیں بھی اس نسل میں جنم لیتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن دقت تو یہ پڑتی ہے۔ کہ یہ قدیمی مشہور تاریخی عورتیں تعداد میں بہت تھوڑی ہیں اور جہاں دیکھو جو عورت نظر آتی ہے۔ وہ کسی گذشتہ جنم میں اپنا ہونا انہی ایک یا دو تاریخی عورتوں کا

بتلاتی ہے۔ مثلاً ۱۹۲۲ء میں لندن کے ایک مشہور روزانہ اخبار نے ایک مذاقیہ پیراگراف لکھا۔ جس کا عنوان لندن میں مسو کلیو پیٹرا تھا کلیو پیٹرا مصر کی ایک مشہور ملکہ گذری ہے۔ اخبار نویس کا مطلب یہ تھا۔ کہ یہ تھیاسوفسٹ عورتیں جو اسبات کی مدعی ہیں۔ کہ وہ اپنے پہلے جنم کو جانتی ہیں استفسار پر علے العموم کلیو پیٹرا کا نام لیتی ہیں۔ یعنے پہلے وہ کلیو پیٹرا تھیں۔ لیکن کلیو پیٹرا تو تاریخ میں ایک ہی ملکہ ہے۔ یہ ایک جنم میں سینکڑوں کلیو پیٹرا کہاں سے آسکتی ہیں۔ اسی رنگ کے بعض اور بھی دلچسپ مرد ہمیں یورپ میں ملتے ہیں۔ گو عورتوں کے مقابل اُن کی تعداد تھوڑی ہے۔ لیکن اُن کا بھی ادعا یہی ہوتا ہے۔ کہ وہ پچھلے جنم کو جانتے ہیں۔ جب اُن سے پوچھو کہ وہ پچھلے جنم میں کیا تھے۔ تو کسی راجہ یا بڑے برہمن کا نام لیتے ہیں۔ بہر حال جس مرد یا عورت سے ملو اور اُن سے دریافت کرو تو وہ اپنے پچھلے جنم کو بہت اُونچا بتلاتے ہیں۔ ایک بھی ایسا شخص نہ ملیگا جو اسبات کو قبول کرے۔ کہ وہ اپنے کسی گذشتہ جنم میں کوئی ادنے

ہستی رکھتا تھا۔ لیکن جو بات انھیں اس تف تحماصیہ کی دُھن میں بھول جاتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ گذشتہ جنم کی خوبیاں آیندہ جنم میں وہی شخص کھوتا ہے۔ جو اُس جنم میں کسی نہ کسی قسم کا گناہ کرتا ہے۔ لہذا یہ لوگ مرد یا عورت اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ پہلے کلیوپیٹرا یا مہارانی یا راجہ یا وِدوان پنڈت یا بزرگ رشی تھے۔ اور اب جو وہ اس ادنے حالت میں آ گئے ہیں۔ تو ضرور اُنھوں نے اس جنم میں خطرناک بدمعاشیاں اور غلطیاں کی ہیں جن کی پاداش میں وہ اُس اعلٰے حالت سے تنزل کر کے اس موجودہ ادنٰے حالت میں آ گئے ہیں +

قرآن کریم کی سُورۂ نحل نے انسان کے ذرائع علوم پر بحث کی ہے۔ اور الہام الٰہی کو ہی علم کا صحیح ذریعہ ٹھیرایا ہے۔ اس لئے اس سُورۂ شریف میں اس امر کی تصریح کی بھی ضرورت تھی۔ کہ علم کے حصول کیلئے اس دنیا میں بار بار آنا ضروری ہے یا نہیں۔ چنانچہ مندرجہ بالا دو آیات نے تناسخ کے اس نظریہ کو نہایت خوبصورتی سے غلط ثابت کر دیا۔

ایک طرف تو یہ کہا۔ کہ جب تم شکم مادر سے یہاں آتے ہو تمہارے اندر کوئی علم نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ تمہیں آنکھ اور کان اور دل دیتا ہے۔ کیونکہ علم حاصل کرنے کیلئے حواس خمسہ میں سے آنکھ اور کان ہی بہترین ذریعے ہیں۔ ان کے ذریعے بہت سی باتیں ہم معلوم کرتے ہیں۔ پھر یہ علم دل کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ جو اُس پر محاکمہ کر کے مرغوب باتوں کو حافظہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہی ہمارا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں یہ کہا کہ اس دُنیا میں اُن اسباب کے ہوتے ہوئے جنھیں اہل تناسخ حصول علم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اور جن کی خاطر اس دُنیا میں پھر واپس آنا تجویز کرتے ہیں۔ انسان ایک عمر کو پہنچ کر بعض وقت بینائی اور شنوائی ہی گنوا بیٹھتا ہے۔ بعض وقت دل یا قوت محاکمہ کو کھو دیتا ہے۔ جو علم حاصل شدہ ہے۔ وہ بھی ضائع چلا جاتا ہے۔ اہل تناسخ تو کہتے ہیں۔ کہ انسان اس دُنیا میں مرنے کے بعد آئے لیکن ارذل عمر تک پہنچا ہُوا انسان آٹھوں پہر چاہتا ہے کہ وہ اس دنیا سے جلد رخصت ہو۔

اس دنیا میں انسانی حواس علم کے خارج ہیں

ان ظاہری حواس خمسہ کے علاوہ انسان میں اندرونی حواس بھی ہیں۔ جن کے روشن ہونے پر انسان کا علم بہت بڑھتا ہے۔ انسان کشفی آنکھوں اور کانوں سے وہ باتیں دیکھتا اور سنتا ہے۔ جو ظاہری کان اور آنکھ۔ دیکھ یا سن نہیں سکتے۔ آج یہ باتیں دنیا کے نزدیک قابل تسلیم ہوگئی ہیں۔ ان قوتوں کو اہل مغرب نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ بعض صاحب تجارب بھی پیدا ہوگئے۔ خود بعض ہندی رشیوں میں بھی یہ باتیں موجود تھیں۔ یوگ کی کتابوں میں ان اندرونی حواس کے روشن کرنے کے لئے قواعد منضبط ہیں۔ سادھن کے طریق اور اُس کا مقصد یہی ہے۔ کہ انسان کی باطنی قوتیں روشن ہوجائیں۔ اور ان سب کا مقصد حصول علم ہی ہے۔ معمولی حواس کے ساتھ دُور کا علم ہمیں خود وہاں جاکر حاصل کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ آنکھ وہاں نہیں پہنچ سکتی لیکن ایک صحیح معنوں میں سادُھو جسے مسلم اصطلاح میں صوفی کہتے ہیں۔ جو اپنی ریاضتوں کے ذریعے اندرونی

آنکھوں کو روشن کر چکا ہے۔ وہ گھر بیٹھے سینکڑوں میل پرے کا تماشہ کر سکتا ہے۔ دل کی باتیں اور سینے کے بھید ہم ان آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے نہ پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے کے سینے کے بھید پڑھنے والے ادّعائی طور پر یا حقیقی طور پر آج موجود ہیں۔ یہ کمالات جو کہیں خال خال نظر آتے ہیں۔ آنے والی دُنیا میں بر روئے تعلیم قرآن ایک اجنبی زندگی کے لوازمات سے ہونگے۔ جنت کی حقیقت یہی ہے۔ کہ وہ انسانی قوتیں جو نطفے میں موجود ہیں۔ جن کا ظہور ایک حد تک رحم مادر میں اور پھر رحم دنیا میں ہو جاتا ہے۔ وہ کامل طور پر اُس عالم میں ظاہر ہو جائیں گی۔ جبکہ انسانی مُدرکہ اس دنیا کے جسمانی لباس سے جو دراصل ایک بڑا بھاری پردہ ہے آزاد ہو جائیگا۔ جنتی زندگی کے متعلق ہمیں بتلایا گیا ہے۔ کہ انسان جہاں چاہے آنِ واحد میں جا سکیگا جو علم چاہیگا آسانی سے حاصل کر سکیگا۔ یعنے دُور کی بات دیکھ لیگا اور سُن لیگا۔ الغرض بینائی۔ شُنوائی اور اَور کل کے کُل قوٰے جو ذریعۂ علوم ہیں۔ وہ بہت ہی بڑھ جائینگے

یہ قوتیں اس وقت بھی انسان میں استعداداً موجود ہیں
ایک حد تک یہ استعدادیں بعض لوگوں میں پیدا ہی
ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ قوتیں اُس وقت بلوغت تک
پہنچینگی۔ جب یہ ارضی جسم نہ ہوگا۔ وہ لوگ جو
اس دنیا میں تھوڑا بہت ان قوتوں کو حاصل
کر لیتے ہیں۔ وہ وہی ہیں جو جسم کو مار کر جسمانی
تقاضوں کی حکومت سے اپنے آپ کو آزاد کر لیتے
ہیں۔ تزکیہ نفس یا سادھن کے طریق زیادہ تر
جسمانی خواہشوں کے مارنے کے ہیں۔ جسم ہی
دراصل صحیح علوم کو حاصل کرنے میں حارج ہوتا
ہے۔ جب تک ہم اس دنیا میں ہیں۔ ہم جسم
سے تو الگ نہیں ہو سکتے۔ ہاں جسمی تقاضوں
کو مار سکتے ہیں یا اُنھیں کمزور کر سکتے ہیں۔ کیا جو
کسی نہ کسی حواس کو گنوا بیٹھتے ہیں۔ اُن کے
ذہنی قوے مضبوط نہیں ہو جاتے۔ کیا جب ہم
کسی بات کو سوچتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کو
کسی نقطہ پر جمانا چاہتے ہیں۔ تو ہم آنکھیں
بند نہیں کر لیتے۔ اس عمل سے ہم خود ظاہر کر دیتے
ہیں۔ کہ ہماری آنکھیں صحیح علم کے حصول میں

خارج ہوتی ہیں ۔ الغرض حیات بعد الموت وہ زندگی ہے ۔ جس میں قوت مُدرکہ جسمانی تقاضوں سے آزاد ہو کر صحیح علم کے حاصل کرنے کے قابل ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ ارضی جسم تو وہاں نہیں ہوگا ۔ اور اس کے ظلماتی پردے سب دُور ہو جائیں گے ۔ اور اندرُونی آنکھیں روشن ہو جائینگی یہ کوئی قصہ کہانی نہیں ۔ یہ حقائق ہیں ۔ یہاں بھی جو لوگ جسمانی تقاضوں کو دبا لیتے ہیں ۔ وہ بھی کبھی کبھی ایسی آنکھیں پا لیتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کی آیت ذیل اس طرف اشارہ کرتی ہے ؛
لقد كنت فی غفلة من هذا فكشفنا عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد (سُورۂ ق آیت ۲۲) تم تو ان باتوں سے لاپرواہ تھے ۔ لیکن اب ہمنے تم سے پردہ دُور کر دیا ہے ۔ اور تمہاری آنکھیں روشن ہو گئی ہیں ؛
یہاں ہم اپنے اعمال کے صحیح نتائج اور اُن کے اثرات دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے ۔ مرنے کے بعد یہ جسمانی پردہ دُور ہو جائیگا ۔ اور آنکھیں تیز ہو جائینگی آنکھوں میں بالقوہ اب بھی استعداد ہے ۔ لیکن وہ قُوت جسمانی پردوں تلے دبی ہوئی ہے وہ جب دُور ہو گئے تو

قوت کام کرنے لگیگی ٭

ہم اس دُنیا میں تو صرف اپنی اندرُونی آنکھ
اور کان میں ایک قسم کی استعداد پیدا کرنے آئے
ہیں ۔ جس کے پیدا ہونے پر ہم جب جسم ارضی
سے الگ ہوں تو حقائق اشیاء کو کما حقّہٗ دیکھ سکیں
کیونکہ موت کے بعد ہی ہماری آنکھوں سے ایک
بڑا بھاری پردہ اُتر جائیگا ۔ اور ہم حقائق اشیأ
کے سامنے آجائیں گے ۔ کیا صحیح علُوم کے حاصل
کرنے کے لئے وہ صُورت زیادہ موزُوں ہے ۔ یا
یہ کہ مرنے کے بعد کسی علم کی تکمیل کے لئے ہمیں اس
ظُلماتی دُنیا میں پھر واپس لایا جائے ۔ جہاں ہمارے
حواسِ علم جسمانی پردوں میں مستُور ہو کر صحیح کام نہیں
کرتے ۔ ہم اگر ان علُوم باطنیّہ کے حاصل کرنے کیلئے
جنگلوں بیابانوں میں چلے جاتے ہیں ۔ پہاڑ
کی غاروں میں اپنا مکان بناتے ہیں ۔ یا شہر میں
رہ کر خلوت کی کوٹھڑی تلاش کرتے ہیں ۔ تاریک جگہ
میں بیٹھ کر مکان کے کواڑ بند کر لیتے ہیں ۔ اگر کوئی
منفذ ہوا کا بھی ہو تو اُسے بند کر دیتے ہیں ۔ تاکہ
باہر کی آواز یا باہر کی روشنی اندر آکر آنکھ اور کان

کے ذریعہ ہماری یکسوئی میں فرق نہ ڈالے۔ یہ طریق عمل صاف اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ جسمانی حواس یا اس دنیا کی چیزیں ہمارے حصول علم میں خارج ہیں۔ جب ہم حصول علم کے لئے خود یہاں دُنیا کو چھوڑتے ہیں۔ اور اس کے نعماء پر لات مارتے ہیں۔ تو پھر مرنے کے بعد تو ہم اس دُنیا سے بھی الگ ہو گئے۔ اور اس دُنیا کے جسم سے بھی الگ ہو گئے۔ جن کے تقاضے ہمارے لئے حجاب اکبر ہو رہے تھے۔ تو پھر کیوں ہم اس طرف آئیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض لوگ یہاں سے ضروری استعدادوں کو تربیت دے کر نہیں رُخصت ہوتے۔ مرنے پر اُنکی عدم استعدادہی بروقت حصول علم باعث مصیبت ہوگی۔ مثلاً چند اشخاص ایک تاریک کمرے میں بیٹھے ہوں۔ اور باہر سورج کی تیز روشنی ہو۔ ان میں سے بعض ایسے ہوں جو سورج کی روشنی برداشت نہیں کر سکتے۔ اب اگر یہ سب کے سب سورج کی روشنی میں آجائیں۔ تو ان سب میں حصول علم کے لئے قابلیت تو صدہا درجہ زیادہ پیدا ہو جائیگی۔ لیکن وہ آنکھیں جو سورج کی روشنی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں سخت تکلیف میں پڑ جائینگی۔ چُندھیا جائینگی۔ قوتِ

بصارت کھو بیٹھینگی۔ اور علاج کی محتاج ہو جائینگی
ایسے لوگ پسند کریں گے۔ کہ خواہ
آنکھوں کا علاج وہیں کر دیا جائے۔ اور
اُنھیں اس قابل کر دیا جائے۔ کہ وہ سورج کی روشنی
برداشت کر سکیں۔ لیکن وہ اس اندھیری کوٹھڑی
میں واپس جانا پسند نہیں کرینگے۔ جہاں سے وہ
نکلے تھے۔ کیونکہ وہاں تو وہ اشیاء کی حقیقت کو
نہ دیکھ سکتے تھے۔ مرنے کے بعد جیسا کہ قرآن کریم
کی آیات بالا کہتی ہیں۔ انسان کی بھی یہی حالت
ہوگی۔ جسمانیات کا حجاب ابر پھٹ جائیگا۔ اور
انسان کامل روشنی میں ہوگا۔ جو اس روشنی کی برداشت
کر لینگے۔ ان کا علم آن واحد میں اس قدر ہوگا۔
جو یہاں ایک مدت مدید تک بھی حاصل نہ ہو۔ لیکن
جو روشنی کی برداشت نہیں کر سکتے اُنھیں اس قابل
بنانے کے لئے کسی دردناک علاج کو برداشت کرنا
ہوگا۔ جسے نار جہنم کہتے ہیں۔ کیا یہاں بگڑی
ہوئی آنکھوں کا جو علاج ہوتا ہے۔ وہ کچھ کم تکلیف
دیتا ہے۔ اسی سے عذاب دوزخ کی حقیقت سمجھ لو +

رجعتِ عناصر

کائنات میں چیزیں بنتی ہیں۔ اور بگڑتی ہیں ذرّاتِ عالم کسی ہیولے میں جمع ہوکر کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر جب اس شکل پر فنا وارد ہوتی ہے تو وہی ذرّات جدا اور منفرد ہوکر اپنی اصل شکل میں یا کسی سابقہ شکل میں جا ملتے ہیں۔ عناصر کی اس قسم کی رجعت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی حقیقت نے بعض اہل تناسخ کو اس کہنے پر آمادہ کر دیا ہے کہ جب کسی شکل کے ذرات اس شکل کے فنا ہونے پر پھر اپنی اصلی حالت کی طرف عود کرتے ہیں۔ تو کیوں انسان موت پر واپس نہ آئے۔ پتّے خزاں کے آنے پر جھڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی شادابی اور سرسبزی کو خزاں کے موسم میں گنوا دیتے ہیں زرد ہوکر آخر کار ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہی ریزے ذرّاتِ عالم میں جا ملتے ہیں۔ یہی بات ہر ایک چیز میں ہے۔ جب ایک پتہ جو بالکل شاداب اور مکمل ہے فنا ہوکر عالم ذرّات کو واپس چلا آتا ہے۔ اور پھر اسکے ذرّات از سر نو پتّے بنتے ہیں۔ تو کیوں انسانے

جسم موت کے بعد آگ کے ذریعہ یا مٹی کے ذریعہ اپنی اصل یعنی خاکی ذرات کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی قابل نہ سمجھا جائے۔ کہ وہ اسی عالم میں واپس آئے۔ یہ دلیل دراصل ایک سطحی خیال ہے۔ اگر تو پتّوں کے اجزا کی یہ واپسی صرف ناقص پتّوں سے ہی وابستہ ہوتی۔ اور پختہ پتّوں کے ذرات واپس نہ آتے تو یہ نظریہ صحیح ہوتا۔ کیونکہ حسب قیاس مندرجہ بالا ضرورت تناسخ یہ بتلائی گئی ہے۔ کہ انسان علی العموم اسی دنیا سے ناقص حالت میں جاتے ہیں۔ لہٰذا انھیں کمال مطلوبہ حاصل کرنے کیلئے اسی دنیا میں واپس آنا ہے۔ اور وہ انسان جو کامل ہو کر یہاں سے جاتے ہیں۔ انھیں واپسی کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بات تو پتے کی مثال پر منطبق نہیں ہوتی۔ کیونکہ درختوں کے پتے خواہ ناقص ہوں یا کامل سب کے سب فنا ہونے پر ذراتی شکل میں واپس آجاتے ہیں +

جوہر و عرض

بات یہ ہے۔ کہ ہر ایک چیز میں ایک جوھر ہوتا ہے اور ایک عرض۔ جوہر تو وہ چیز ہے۔ جس نے کسی چیز

کے اندر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یا اُس کے وہ خواص سے ظہور کے لئے وہ چیز بنی ہے۔ عرض وہ چیز یا دہ اسباب ہیں جنھیں جوھر بطور لباس اپنے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ ہر ایک بیج میں ایک جوہر یہ ہے۔ کہ وہ ایک عمدہ پھل یا پھول پیدا کرے۔ اس پھل اور پھول کے پیدا کرنے کے لئے وہ کچھ زمین کے اجزا۔ کچھ کاربن۔ کچھ کاربن ہائیڈروجن۔ کچھ سورج کی روشنی کچھ اور چیزیں کائنات سے لیلیتا ہے۔ اور ایک درخت کی شکل اختیار کرتا ہے جسمیں سے پھل اور پھول پیدا ہو جاتے ہیں اب اگر پھل یا پھول کو درخت سے الگ کر دیا جائے اور درخت یا پتوں کے اجزا منفرد ہو کر ذرّات عالم میں جا ملیں تو اُس کا اثر پھل اور پھول پر کیا۔ کیونکہ اصلی جوہر جو تخم میں تھا۔ اب اُس نے پھل اور پھول کی شکل اختیار کرلی۔ پھر اگر پھول کو ہم عطر یا عرق کی شکل میں منتقل کر دیں۔ تو بہت سا حصّہ پھول کا فنا ہو کر ذرّات میں جا ملیگا لیکن جوہر اب عطر کی شکل میں آگیا ہے۔ اسی طرح عطر کا سونگھنا انسان کے دل ودماغ کو طاقت بخشتا ہے۔ اب وہ

جوہر دماغی یا قلبی قوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور
اُس کے بہت سے اجزا جو در اصل عوارض تھے۔ وہ
ہوا میں ملجاتے ہیں۔ اسی طرح کسی درخت کا پھل اگر معدہ
میں جاکر خون صالح کا مولد ہو جائے۔ تو اُس درخت کا
جوہر تو فنا نہیں ہوا۔ وہ تو خون کی شکل میں آگیا
ہاں اُس کے عوارض عالم ذرات میں جا ملے۔ اسی طرح
انسان کی موجودہ شکل میں ہر ایک جوہر موجود ہے اس
جوہر کو روشن کرنے کے لئے اُس کے کل کے کُل جسمانی
قوے اور اُن جسمانی قوے کے ذرات بطور عوارض
کے ہیں۔ وہ جوہر جس نے قالب انسانی میں نشوونما
پاتا ہے۔ وہ اس کا مدرکہ ہے۔ جس کو بعض رُوح
کہتے ہیں۔ بعض اُسے لطائف قلبی سے تعبیر
ہیں۔ مدرکہ ہی اصل جوہر ہے۔ جس نے قالب انسانی
میں بعض کیفیات کو پیدا کرتا ہے۔ یا جیسا کہ ہینے
اوپر بیان کیا اپنے اندر اُن استعدادوں کو پیدا کرتا
ہے۔ جنہوں نے عالم بعد الموت میں ایک اور قسم کا
کمال حاصل کرنا ہے۔ الغرض ہر ایک چیز کا جوہر
اپنی بلوغت کاملہ کے لئے ایک عالم سے نکلکر دوسرے
عالم میں چلا جاتا ہے۔ اس پر کوئی فنا نہیں۔ وہ جس عالم

ہیں جاتا ہے۔ وہاں کے مناسب حال لباس وہیں سے
جالیتا ہے۔ یہ لباس اُس عالم کے عناصر سے بنتا ہے۔
جب وہ اُس عالم کے ودیعت کردہ ترقی کو حاصل کرلیتا ہے
تو پھر اُس عالم یا اُس ہیولئے سے نکل کر دوسرے عالم
کی طرف چلاجاتا ہے۔ اِس کا نام فنا یا موت ہے۔ جسکے
معنے یہ ہیں۔ کہ جوہر حقیقی نے اب اُس لباس کو
چھوڑ دیا ہے۔ جسمیں وہ ملبّس تھا۔ اُس کے چلے جانے
پر لباس مذکورہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ
جو کہا جاتا ہے۔ کہ ذرّات جسم انسانی اپنی اصلیت کی
طرف عود کر رہے ہیں۔ وہ تو انسان کے مرنے سے
پہلے ہی آٹھوں پہر واپس ہوتے رہتے ہیں۔ آج
تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا ہے۔ کہ سات سال کے
عرصہ میں جسم انسانی کا ذرہ ذرہ جسم سے جدا ہو کر کائنات
میں جا ملتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر سات سال کے بعد
انسان کا گوشت پوست اور اُس کی ہر ایک چیز
وہ نہیں ہوتی۔ جو سات سال پہلے تھی۔ وہ سب
چیزیں فنا ہو کر کائنات میں جا ملی ہیں۔ اور
نئے ذرّات نے آکر سات سال میں نیا جسم لیلیا ہے
اب سوال یہ ہے۔ کہ وہ جوہر انسانی جس کا نام مدرکہ

انسانی ہے۔ کیا وہ بھی یا اُس کا کوئی حصّہ ان سات سالوں
میں جُدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ اُس کے جدا ہونے
کا نام تو موت ہے۔ حالانکہ جسم کا ذرّہ ذرّہ ہر آن واحد
میں جسم سے جُدا ہو رہا ہے۔ اور اُس پر فنا اور موت
وارد ہو رہی ہے۔ لیکن جوہر انسانی یا مدرکہ نہ صرف
قائم ہی رہتا ہے۔ بلکہ دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ اگر تو
اُن ذرات کے ساتھ مُدرکہ کا بھی کوئی حصہ چلا جاتا
تو پھر اہل تناسخ کا یہ نظریہ صحیح ہوتا۔ اس قضیئے کو
ایک اور مشاہدہ مبرہن کر دیتا ہے۔ جسم انسانی اور
اُس کے ہر ایک اعضا و جوارح ایک حد تک ترقی کرتے
ہیں۔ اُس کا جسم ایک خاص قد کو حاصل کرتا ہے
اُس کے مختلف اعضا۔ دل۔ جگر وغیرہ ایک خاص
مقدار کی جسامت حاصل کرتے ہیں۔ اُس کے بعد
جسمی ترقی بند ہو جاتی ہے لیکن اُس کا مُدرکہ یا بالفاظ
عامہ اُن کا دماغ اس کے ذہنی قوئے اُس کے احساسات
جذبات سب کے سب روبترقی ہوتے ہیں۔ اگر تو جس طرح
جسم کی مقررہ ترقی کے بعد اُس کی آیندہ ترقی رُک جاتی
ہے۔ اور اِنکی ترقی بھی رُک جاتی تو کچھ بات بھی تھی
لیکن یہ صورت نہیں۔ مُدرکہ اپنی ترقی کے لئے اس عالم

میں ایک صحیح جسم کو چاہتا ہے۔ جس کی مقدار اور مساحت ایک خاص مقدار کی ہونی چاہیئے۔ اُس کی آٹھوں پہر اُسے ضرورت ہے۔ وہ جسم ہر آن واحد میں فنا بھی ہوتا ہے۔ اور بنتا بھی ہے۔ پرانے ذرات اپنا عمل کر کے بیکار ہو جاتے ہیں۔ جسم سے جدا ہو کر کائنات میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن جوہر انسانی اور اُس کا مُدرکہ اس جسم میں موجود رہتا ہے۔ اور دن بدن بڑھتا جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ اس کے بعض اجزا فنا ہوتے ہیں۔ اور نئے اجزا پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے غلط ہے۔ کہ مُدرکۂ انسانی منٹ بہ منٹ ترقی کر رہا ہے۔ حالانکہ جسم ترقی نہیں کرتا۔ اصل بات یہی ہے کہ چیزوں کے جوہر فنا نہیں ہوتے۔ اگر تو مُدرکۂ انسانی ترقی نہ کرتا۔ اور جسم کی طرح ایک حد تک پہنچ کر اپنی ترقی میں ساکن ہو جاتا تو یہ خیال ہو سکتا تھا۔ کہ اب اس کی زندگی وقتی ہے۔ اور ایک دن جسم کے ساتھ فنا ہو کر اصلی حالت کو عود کریگا لیکن اُس کی ترقی تو بدستور ہے۔ اب اگر جسم کی طرح وہ ترقی میں نہیں رُکتا تو پھر یہ کہنا کہ وہ جسم کی طرح پرانے ذرات کو پھینکتا جاتا ہے۔ اور

نئے ذرّات کو لیتا جاتا ہے۔ غلط ہو جاتا ہے خلاصہ یہ ہے۔ کہ فنا جو ہے وہ تو عوارض پر یا جسم پر لاحق ہوتی ہے۔ لیکن جوہر پر نہیں۔ مُدرکۂ انسانی ایک غیر فانی چیز ہے۔ اور اس کا قدم ترقی ہر آن واحد میں آگے کو ہے ۔

نظریۂ اعمال یعنی کرما کی تھیوری

اختلافِ مدارج

مسئلۂ تناسخ کی دوسری شکل کرما تھیوری یا نظریۂ عمل ہے۔ مکافاتِ عمل سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ بدعملی کا نتیجہ بدی اور نیکی کا نتیجہ نیکی ہوتی ہے۔ ہمارے اعمال کے نتائج کچھ جلدی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کچھ اپنے ظہور میں ایک لمبا وقت چاہتے ہیں۔ مجھے اسی امر پر غور کرتے ہوئے حیات بعد الموت پر یقین آ جاتا ہے۔ جب کوئی عمل بیکار نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی نتیجہ کو پیدا کرتا ہے۔ تو بہت سے ایسے اعمال کے نتائج کے ظہور کے لئے جن کے نتائج یہاں مرتّب نہیں ہوتے۔ کوئی نہ کوئی اور عالم

بھی ہونا چاہیئے۔ عام اس سے کہ وہ اسلامی جنّت و دوزخ ہو یا اسی دُنیا میں پھر واپس آنا ہو۔ الغرض موت کے بعد کہیں نہ کہیں اس زندگی کے اعمال کے نتائج ظاہر ہونے چاہئیں۔ مسئلہ کرما کے ماننے والے کہتے ہیں۔ کہ ہم اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے کے لئے اسی دُنیا میں پھر واپس آتے ہیں +

دُنیا کا تمدّن اور ترقی مختلف مدارج کو چاہتی ہے انسانی ضروریات کچھ اس قسم کے بیشمار ہیں۔ اور اُن کی نوعیّت کچھ اس قسم کی مختلفہ ہے۔ کہ انسان کی اپنی کوششیں اُن کے دفعیّہ کے لئے مکتفی نہیں اسمیں شک نہیں۔ کہ انسان اپنی ہر ضرورت کے دفعیّہ کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن صحیح تمدن انسانی اسی میں ہے۔ کہ زید کی دفع ضروریات کا تہیّہ سوسائٹی کے دیگر افراد کریں۔ اور اُن افراد کی کسی ضرورت کا علاج زید کرے۔ الغرض انسانی تمدن و تہذیب کی کل اسی طرح چل سکتی ہے۔ کہ انسانی سوسائٹی میں مختلف مدارج ہوں۔ ادنٰے اعلٰے۔ درمیانی حالتیں سب کی سب آسائش انسانی کے لئے ضروری ہیں مہتر یا چمار خواہ کیسی ہی ذلیل سے ذلیل زندگی بسر کریں

انسانی آسائش کی زنجیر میں وہ ایک ضروری کڑی ہے
الغرض آسائش اور تمدن کے لئے انسانی سوسائٹی
کو مختلف مدارج میں تقسیم ہوتا ضروریات سے ہے
کرما والے یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ مختلف مدارج ہمارے گذشتہ
اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ایک جنم میں اچھے اعمال میں آئیندہ
جنم کی راحت اور خوشی بخشتے ہیں۔ اگر ہم مرفع الحال
گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ تو یہ ہمارے گذشتہ
نیک اعمالوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی اگر ہم اس عالم
میں ادنےٰ حالات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں مثلاً
کسی چوہڑے چمار کے ہاں پیدا ہوئے تو یہ گذشتہ جنم
کی بدعملی کا نتیجہ ہوتا ہے +

چماری خاندان یا شاہی خاندان تو دو انتہائیں ہیں
لیکن ان دو حالتوں کے درمیان بھی جسقدر مدارج
ہیں۔ وہ سب کے سب ایکدوسرے سے مختلف ہیں
ہر جگہ ادنےٰ و اعلیٰ اور خادم مخدوم کا سوال موجود ہے۔ زید اگر بکر کا
خادم ہے۔ تو بکر خالد کا خادم ہے۔ اس سلسلہ کی کوئی انتہا ہی
نہیں۔ ہر جگہ ادنےٰ اعلیٰ نظر آتے ہیں۔ ہمارا
تمدن اور ہماری آسائش اور ہماری راحتیں جیسے کہ
میں نے اوپر کہا ہے۔ کل کی کل اس بات پر حصر

رکھتی ہیں۔ کہ کوئی اعلےٰ ہو کوئی ادنےٰ ہو۔ کوئی خادم ہو کوئی مخدوم ہو۔ اب اگر یہ اختلاف مدارج یا کسی کا ادنےٰ حالت میں پیدا ہوتا۔ گذشتہ بدعملیوں کا نتیجہ ہے۔ اور کسی کے گذشتہ جنم کے گناہ اور پاپ ہی اُسے آیندہ جنم میں نوکر اور خادم بناتے ہیں۔ تو ہر نسل کی آسائش۔ آرام۔ تمدن۔ تہذیب سب کی سب اسبات پر منحصر ہے۔ کہ اُس نسل کے انسانوں سے پہلے کسی جنم میں گناہ اور پاپ کثرت سے ہوں۔ یعنی اگر تمدن کے لئے اختلاف مدارج ضروری ہیں۔ اور ایک اعلےٰ ہستی کے نیچے کل کی کل ادنےٰ ہستئیں یا ہر ایک انسان دوسرے کے مقابل میں کسی نہ کسی رنگ میں اعلےٰ ادنےٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ خادم مخدوم کا سلسلہ ایک ضروری سلسلہ ہے۔ تو پھر گناہ بھی ہمارے تمدن کے لئے ایک جُزو لاینفک ہے۔ اگر بالفرض کوئی بھی گناہ نہ کرے۔ تو پھر اگلے جنم میں کوئی بھی ادنےٰ حالت میں پیدا نہ ہوگا۔ کوئی بھی کسی کا خادم نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں تمدن کی کل کیسے چلیگی۔ اس لئے لازمی امر ہے۔ کہ انسانی نسل کے ہر جنم میں گناہ ہوں۔ یہ تو خیر انسانی سوسائٹی

کے متعلق بحیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر مسئلہ تناسخ ہی صحیح ہے۔ تو فرداً فرداً انسانی راحت بھی بدی کو لازمی ٹھیراتی ہے۔ عموماً وہی لوگ اس دُنیا میں راحت اور سُکھ کے سامان اپنے لئے پیدا کر لیتے ہیں۔ جو ابتدائے زندگی میں طرح طرح کی تکالیف اور مشقت کو برداشت کرتے ہیں۔ ابتدائی زندگی کی مشقت ہی آیندہ کی راحت کا موجب ہوتی ہے لیکن اگر مشقت اور تکلیف کسی گذشتہ جنم کی بدعملی کا نتیجہ ہے۔ تو پھر دنیا میں کوئی خوشی حاصل نہیں کرسکتا۔ جب تک وہ پہلے بدعمل اور بدکردار نہ ہو چکا ہو۔ یہ کس قسم کا گھناؤنہ مسئلہ ہے۔ کہ جس کے ماتحت گناہ کا وجود ایک ضرورت حقہ ہو جاتا ہے۔ گناہ بذات خود ایک بُری چیز سہی۔ لیکن یہ تو کرما فلاسفی کے ماتحت آیندہ کے جنم والوں کے لئے ایک عمدہ سرمایہ راحت ہے۔ جب کوئی گناہ کرے اور اُس کی یاداش اُسے اگلے جنم میں نوکر بنائے تو پھر دوسرے کو راحت حاصل ہو۔ اس صورت میں گناہ کیوں قابل نفرت سمجھا جائے۔ کوئی چیز بذات خود بُری نہیں۔ اگر وہ کسی فرد یا افراد سوسائٹی کے نقصان کا موجب ہے۔ تو وہ

بد ہے۔ لیکن اگر کوئی فعل یا کوئی امر دوسروں کی راحت اور آسائش کا موجب ہو تو وہ فعل مستحسن ہے۔ اسی کا نام نیکی ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا بحث کے ماتحت ایک نسل کے گناہ اُن کی بدعملیاں جب دوسری نسل کے لئے باعث راحت اور آسائش ہوں تو پھر ان کا نام بدی نہیں ہو سکتا گناہ اور بدیاں تو ضرور ہوتی ہیں۔ لیکن کوئی تو ایسا عالم ہو کہ جہاں بدی کا وجود مفقود ہو جائے +

اگر دُنیا کی حکمران وہ ہستی ہے جو خیر محض

ہے۔ اور جو انسان کو ہر قسم کی بدیوں سے پاک دیکھنا چاہتی ہے۔ تو پھر وہ ہستی کس طرح نیک و خیر کے صفات سے متصف سمجھی جا سکتی ہے۔ اگر اُسکے بنائے ہوئے نظام تلے انسان کبھی بھی گناہ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر انسان ایک نہ ایک عالم میں جا کر گناہ سے آزاد ہو جائے۔ اور یہی حقیقی راحت ہے۔ تو پھر خدا کی ذات پر کوئی اعتراض نہیں رہتا۔ لیکن اگر ایک جنم کا گناہ ہی بذات خود دوسرے جنم کی راحت انسانی کے لئے ضروری ہے۔ جیسا کہ ہیں نے

اُوپر بیان کیا - تو پھر یہ لازمی امر ہے کہ نسل انسانی کبھی بھی گناہ سے آزاد نہ ہو +

اسلام اس بات کی تعلیم کرتا ہے - کہ انسان آخر کار راحت تامہ کو حاصل کریگا - اور گناہ و بدی سے پاک ہو گا - وہ گنہگار زندگی لے کر بیشک یہاں سے جائے - لیکن اُس زندگی کی اصلاح ہو گی - دوزخ کا عالم انسان کی اصلاح کا عالم ہے - جسمیں سے نکلکر وہ ہمیشہ کے لئے پاک صاف ہو جاتا ہے - اور پھر اُن ترقیات کے عالموں میں جا داخل ہوتا ہے - جہاں گناہ اور بدی کا نام نہیں - اسی کا نام راحتِ ابدی ہے - یہی جنت ہے - یہ امر تو قابل قیاس ہے - کہ زید اپنی بدعملیوں کی سزا بھگتنے - اور کرما تھیوری کے ماتحت اُس کے ایک جنم کے گناہ اُسے دوسرے جنم میں کسی ادنےٰ حالت میں رکھیں - یہانتک تو صحیح ہے لیکن دقت یہ پڑتی ہے - کہ زید کا ادنےٰ حالت میں پیدا ہونا اُس جنم کے دوسرے افراد کی آسائش کے لئے ضروری ہے - اس لئے زید کا گذشتہ جنم میں گنہگار ہونا بھی ضروریات سے ہے - اگر ہمارے اعمال کے نتائج ایک بالا ہستی مرتب کرتی ہے - اگر

خدا تعالےٰ ہی ہمارے نیک اعمال پر ہمیں عوضہ دیتا ہے! اور وہ عوضہ اسی میں ہے۔ کہ ہم راحت و آسائش میں رہیں۔ تو پھر خدا کی بخشش اور اس کے فیض جو ہم پر نازل ہونگے وہ سب صرف اسی ایک بات پر آ رہتے ہیں۔ کہ اور لوگ کثرت سے گناہ کریں۔ اور وہ گنہگار ان لوگوں کی آسائش اور راحت کا موجب ہوں۔ جن کی نیک عملیوں پر خدا تعالےٰ انھیں انعام دینا چاہتا ہے۔ اب اگر یہ دور تسلسل لازم ہے۔ اور انسان نے بار بار ہی دُنیا میں آنا ہے۔ اور اس دنیا میں اختلاف مدارج سے ہی کام چلتے ہیں۔ تو پھر گناہ ایک ضروریات ابدیہ میں سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اِس منطقی ضرورت نے پنڈت دیانند جی کو اور اُس کے ہمخیالوں کو اس بات کے ماننے پر مجبور کر دیا کہ آواگون کے چکّر سے کسی کو نجات نہ ملے +

میں نے ابھی بیان کیا ہے۔ کہ اس دنیا کے کسی فردِ بشر کو دیکھ لیا جائے۔ وہ اختلاف مدارج کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر ایک شخص نسبتی یا اضافی حیثیت میں ادنےٰ اور اعلےٰ ہوتا ہے۔ اور ہر ایک شخص ایک نہ ایک رنگ میں خادم اور مخدوم ہے۔ اس دُنیا میں کون ہے۔ جو کسی نہ کسی حیثیت میں ادنےٰ نہیں۔ اور کسی نہ کسی

نقص میں پھنسا ہوا نہیں - اب اگر ادنےٰ یا ناقص یا خادمانہ حیثیتیں کسی نہ کسی گناہ کا نتیجہ ہیں - تو اس سے لازم آیا - کہ کُل کے کُل انسان چھوٹا موٹا کوئی نہ کوئی گناہ کریں - تاکہ آیندہ جنم کی تمدن کی کل چلے - ایک غلط عقیدہ انسان اختیار کر کے کہاں کا کہاں پہنچ جاتا ہے۔

تناسخ کے متعلّق جناب کرشن کا عقیدہ

جناب کرشن جہاں مسئلۂ عمل کے زبردست حامی ہیں - اور ہر جگہ کرم کانڈ پر زور دیتے ہیں - وہ ساتھ ہی اس آواگون کے قائل نہیں - جو آریہ سماج کا مایہ ناز ہے وہ دراصل آواگون یا تناسخ کے قائل ہی نہیں - وہ انسان کے قالب بدلنے کے تو قائل ہیں - لیکن اس بات کو نہیں مانتے - کہ انسان بار بار اس دُنیا میں واپس آکر جنم لیتا ہے - اُن کی یہی تعلیم ہے - کہ انسان ایک قالب سے گذر کر دوسرے قالب میں چلا جاتا ہے - اور اس کے آگے ترقیات کا راستہ ہے - اور آخرکار وہ ذاتِ خُداوندی میں جا ملتا ہے - اس حالت کا نام جناب کرشن برمھ لوک تجویز کرتے ہیں - اور اپنے آپ کو

برمھ لوک میں پرایت ہوتا بیان فرماتے ہیں - اور سچ کہتے ہیں - آپنے ان مختلف جنموں کی خوب مثال دی ہے - جن میں سے ایک انسان گذرتا ہے - وہ فرماتے ہیں - کہ جس طرح ایک بچہ جوان ہوتا ہے - پھر بوڑھا ہوتا ہے - اسی طرح انسان ایک جنم سے دوسرے جنم میں جاتا ہے - بچگی - جوانی - ضعیفی کے تین عالم ایکدوسرے کے متصل اور یکے بعد دیگرے ہیں - بچگی کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد ضعیفی - اس میں قدم ترقی آگے کو ہے - پیچھے کو نہیں - بچے جوان اور جوان ضعیف ہوتے ہیں - یہ نہیں ہوتا - کہ جوان یا ضعیف ہوکر پھر جوان یا بچے بن جائیں - بچگی کا نقص جوانی میں دور ہوتا ہے - اور جوانی کی غلط کاریاں عمر بڑھنے پر دور ہوجاتی ہیں - یہ نہیں ہوتا - کہ ان غلط کاریوں کے دفعیہ کے لئے ایک انسان پھر بچہ اور جوان ہوجائے جناب کرشن کی تعلیم کے مطابق ہم سب نے ایک ایک دن برمھ لوک میں جانا ہے - برمھ لوک کی حقیقت یہی ہے - کہ انسان میں اخلاق خداوندی پیدا ہوجائیں - اس کا رنگ ڈھنگ - برمھ یعنی خدا کے رنگ ڈھنگ پر ہو - قرآن کریم اُسے

صبغۃ اللہ کہتا ہے ۔ یعنی خدا کے رنگ میں رنگین ہوتا ۔

اب برمھ لوگ اگر وہ راحت ابدی ہے کہ جہاں گناہ کا نام نہیں ۔ اور یہ لوگ ہر ایک کے حصّے میں آتا ہے ۔ تو ایک نہ ایک دن آواگون نے ختم ہونا ہے ۔ لیکن کرما تھیوری کے ماتحت جیسا کہ اُوپر بیان ہوا ہے آواگون کا چکّر لامحدود ہے ۔ اور انسان کبھی گناہ سے پاک نہیں ہو سکتا ۔ جناب کرشن کے ان الفاظ سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے ۔ جہاں وہ فرماتے ہیں ۔ کہ میں اپنے پچھلے جنموں سے واقف ہوں ۔ اس سے یہ مُراد نہیں ۔ کہ وہ بار بار اسی دُنیا میں جنم لے کر واپس آئے ۔ کیونکہ یہ بات اُن کی باقی تعلیم کے خلاف پڑتی ہے اگر وہ اسی دنیا میں بار بار آنے کے قائل ہوتے ۔ تو اس مسئلہ کو بچّہ ۔ جوان بعد بُوڑھا کی مثال دے کر تشریح فرماتے اگر وہ گذشتہ جنموں کا حوالہ دیتے ہیں ۔ تو جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا ہے ۔ وہ ان مختلف عالموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنہیں سے وہ چیز جس نے آخر کار اس عالم ارضی میں انسان بننا ہے ۔ یکے بعد دیگرے گذرتی ہیں ۔ جس کی تشریح میں اُوپر کر چکا ہوں ۔ کرشن جی اُن جنموں

کا ذکر فرماتے ہیں۔ جن میں سے ذرّات عالم ہوتے ہوئے آخرکار انسانی شکل اختیار کر لیتے ہیں +

اختلاف مدارج تو انسانی تمدن کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسلئے اسے گذشتہ جنموں کے گناہوں کا نتیجہ ٹھیرانا نہ صرف گناہ کی جواتربت پر ہی مُہر لگاتا ہے بلکہ یہ مسئلہ ہر حالت میں عمل کرتا ہوُا نظر نہیں آتا آخر اختلاف صنف بھی اختلاف مدارج ہی ہے۔ اب اگر ہندو دھرم سچا ہے۔ اور ہندو دھرم کے قوانین بھی صحیح ہیں۔ تو عورت کی حیثیت مرد کے مقابل بہت کم ہے عورت مختلف پہلوؤں سے خادم اور شوہر ہر معنے میں اُس کا سرتاج ہے۔ پھر اگر ادنئے حیثیت کسی گناہ کا ہی نتیجہ ہے۔ تو یہ تو ممکن ہے۔ کہ کسی نسل کی کُل کی کل عورتیں کسی گذشتہ جنم کے گناہوں کا شکار رہو چکی ہوں لیکن نسل انسانی کا وجود شروع سے ہی عورت اور مرد کو چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ مرد اور عورت جو نسل انسانی کو اوّل دفعہ دنیا میں لائے۔ وہ کس نیکی اور گناہ کے عوضنے میں مرد اور عورت بنائے گئے۔ چنانچہ سورۃ یٰسین میں قرآن کریم جہاں اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ انسان مرنے کے بعد اس دنیا میں نہیں آتا۔ وہاں وہ اُن

دلائل کی بھی تردید کرتا ہے۔ جو تناسخ کی حمایت میں پیش ہوتی ہیں ✦ چنانچہ اختلاف مدارج پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون ۔ تم تو اختلاف مدارج لئے ہوئے ہو۔ اور اختلاف مدارج کو کسی گناہ کا نتیجہ ٹھیراتے ہو۔ یہاں تو کل کا کل نظام اختلاف مدارج پر چل رہا ہے۔ یہ اختلاف مدارج اس لئے ہے۔ کہ مختلف کام۔ مختلف وجود کریں۔ خود پیدائش کائنات کو ہی دیکھ لو۔ نہ صرف مرد و عورت ایک دوسرے کا جوڑ ۔ بلکہ جو کچھ بھی زمین سے نکلتا ہے۔ اور اُگتا ہے وہ بشکل نباتات ہو یا جمادات اور ایسی اور بہت سی باتیں کہ جن کا تمھیں ابھی علم بھی نہیں وہ سب کے سب جوڑے ہی جوڑے ہیں ✦

تیرہ سو برس ہوئے۔ جب قرآن کریم نے یہ حیرتناک راز کھولا۔ اس نے فرمایا کہ نہ صرف مرد و عورت ہی بلکہ کوئی چیز بھی کائنات میں ایسی نہیں جس کا وجود جوڑے کو نہ چاہتا ہو۔ حیوانات۔ اور درختوں کو چھوڑو۔ پتھر کنکر سب کے سب جوڑے کا ہی نتیجہ ہیں۔ ایک قطرۂ پانی بھی ہائیڈروجن اور آکسیجن کے زوجیت ہی سے

پیدا ہوتا ہے۔ کُل کا کُل عناصر میں بھی رشتہ زوجیت ہے، ان سے آگے چل کر اگر ذرّات برقی کے عالم میں آ جائیں تو وہاں بھی منفی مثبت ذرات ایک قسم کے عورت مرد ہیں۔ اثیری ذرّات میں بھی یہی کیفیت ظاہر ہو رہی ہیں۔ الغرض ہر ایک چیز میں زوجیت ہے اور اسی زوجیت سے نظام عالم چل رہا ہے۔ یہ باتیں تو آج علمی انکشاف میں آئی ہیں۔ عرب کے لوگوں کو اسی قدر علم تھا۔ کہ حیوانات کے بعد کھجوروں میں زوجیت کا رشتہ ہے۔ لیکن قرآن نے حیوانات نباتات چھوڑ کائنات کی ہر ایک چیز کو زوجیت کی زنجیر میں جکڑا ہوا بیان کیا ہے۔ بطور جملہ معترضہ میں عرض کرتا ہوں۔ کہ زوجیت مخلوقات کے متعلق یہ بسیط علم جو قرآن کی آیات صاف اور بیّن الفاظ میں دے رہی ہیں۔ کیا کسی انسانی علم کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ انسان تو آج اس نتیجہ پر آیا ہے۔ پھر شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ باریک علم کس نے دیا قرآن کریم بیسیوں جگہ اُن علمی حقائق کو بیان کرتا ہے۔ جو تحقیق جدید نے آج دریافت کیں۔ اُن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ لیکن آج کے اکتشافات

علمی سے صدیوں پہلے اور حقائق علمیہ کو چھوڑ دو صرف
عناصر اور ذرات برقی تک میں رشتہ زوجیت کا ذکر
کر دینا عالم الغیب کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ شارع عرب
کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک آیت ہی اسبات کا ثبوت
ہے۔ کہ قرآن خدائے خالق کی طرف سے ہے +

اس آیت میں قرآن نے یہ تعلیم دی کہ تم تو اختلاف
مدارج کو کسی گذشتہ جنم کے گناہ کا نتیجہ ٹھیراتے ہو۔
یہاں تو کُل کا کُل نظام عالم اختلاف مدارج اختلاف
حیثیت اور اختلاف عمل پر چل رہا ہے۔ اسی اختلاف
عمل اور اختلاف خاصیات نے نظام عالم کو ایکدوسرے
سے جکڑ رکھا ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہو۔ تو تمام نظام
عالم درہم برہم ہو جائے۔ ایسا ہی پہلے عورت مرد کا
اختلاف کس گناہ یا نیکی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی
تو ابتدا ہی اسی نظام سے ہوئی ہے۔ انسان کی پیدائش
سے پہلے تو اُس کے کوئی عمل نہ تھے۔ تو پھر کس بدعملی
نے عورت کو پیدا کیا[1] +

فٹ نوٹ [1] بعض اہل تناسخ تو آواگون کے دور کو نسل انسانی تک ہی محدود رکھتے
ہیں۔ لیکن علے العموم دوسرے یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ مخلوق الٰہی ہر ایک شکل
مثلاً درخت پتھر۔ حیوانات کیڑے مکوڑے یہ سب کے سب انسانی جیو
ہیں جو گناہ کر کے مختلف چیزوں میں جنم لے لیتے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ دراصل

اختلاف فی مابین اختلاف عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ سیارے جو کائنات میں بغیر کسی سہارے کے حرکت کر رہے ہیں۔ اگر ایکدوسرے سے ٹکرا جائیں تو آن واحد میں کائنات تباہ ہو جائے۔ ان کا اپنے اپنے مفوضہ کاموں پر لگے رہنا اُن مخالف اور ایکدوسرے سے مختلف کششوں اور عملوں کا نتیجہ ہے۔ جس کا اثر ایکدوسرے پر پڑتا ہے۔ ہر ایک

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۸۔ کل کے کل انسانی جیو ہیں۔ جو گناہ کے ذریعہ مختلف قسم کے جانور اور اشیاء بن جاتے ہیں تحقیق جدید اس قیاس کی تردید کرتی ہے۔ انسان سے پہلے حیوانات کا وجود آج تسلیم کیا گیا۔ وہ ارضی کیفیت جس کے ماتحت انسان پیدا ہوتا ہے۔ اُس سے پہلے زمین کی کیفیت ایک سیالی کیفیت تھی۔ یعنے پانی تھا۔ جیسے کہ آنحضرت فرماتے ہیں۔ کہ یہ زمین پہلے الماء تھی یعنی کسی خاص قسم کا پانی۔ اسی سے یہ امر لازم آتا ہے کہ انسان سے پہلے زمین پر دریائی مخلوقات ہو۔ لیکن بعض تناسخ والے مچھلیوں میں ان انسانوں کی روحیں تسلیم کرتے ہیں۔ جو کسی گناہ کے ذریعہ دریائی مخلوق بن جاتے ہیں۔ بہرحال اگر یہ کیڑے مکوڑے یا مختلف جراثیم انسان کی ہی مسخ شدہ صورتیں ہیں تو آج تو ایک قطرہ پانی میں ہزاروں جیو ہیں۔ انسان کے خون میں بیشمار جیو ہیں۔ انسان کا کل کا کل جسم جیوؤں کا ہی مجموعہ ہے۔ سکھ ریا آتوجی تو ہر ایک انسانی نباتاتی چیز میں جیو ہی دیکھتی ہے۔ اگر یہ جیو بدعملی کا نتیجہ تھے۔ تو پہلے سب کے سب کہاں سے پیدا ہو گئے۔ انسان کا بول وبراز کروڑ ہا جیوؤں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ کونسے انسان تھے۔ اور اُن کی کونسی بدعملیاں تھیں۔ جنہوں نے سب سے اول کے انسان کے بول وبراز میں اپنا مسکن اختیار کیا۔ ان باتوں سے تنگ آکر آج آخر بعض اہل تناسخ اس امر پر آ گئے۔ کہ انسان دور تناسخ میں انسانی جماعت میں رہتا ہے۔ لیکن یہ الٰہی کتب سنسکرت کو کیا کرینگے +

مخفی

سیارے کو اگر ایک دوسرا سیارہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تو
تیسرا سیارہ اُس کے اُلٹ اُسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔
ان کشش ہائے متخالف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک
سیارہ اپنی مقررہ دور پر حرکت کرتا ہے۔ اس باریک
اور مخفی علم کو قرآن کریم مسئلہ تناسخ پر بحث کرتا ہوا ذیل
کی آیت میں ظاہر کرتا ہے۔ وآیۃ لھم اللیل
نسلخ منہ النھار واذا ھم مظلمون والشمس تجری
لمستقر لھا ذلک تقدیر العزیز العلیم والقمر قدرنٰہ
منازل حتّٰی عاد کالعرجون القدیم لا الشمس ینبغی لھا ان
تدرک القمر واللیل سابق النھار کلٌ فی فلک یسبحون +
اُن کے لئے رات بھی ایک نشانی ہے اسمیں سے ہم دن
نکالتے ہیں۔ پھر دیکھو وہ اندھیرے میں ہوتے ہیں۔ اور
سورج بھی ایک مقررہ امر کی طرف دوڑ رہا ہے۔ پھر خدا
علیم و طاقتور کے مقرر کردہ اندازے ہیں۔ چاند کی بھی
مقررہ منازل ہیں۔ حتّٰے کہ کبھی یہ کھجور کی پرانی شاخ کیطرح
ہو جاتا ہے۔ سورج کو بھی اس امر کی اجازت نہیں کہ
چاند پر غالب آجائے۔ نہ رات دن (کے اوقات) میں
دخل دے سکتی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے محور میں تیر رہا ہے
گویا نظام شمسی میں ہر ایک چیز الگ کام کر رہی ہے

ہر ایک کے لئے مفوضہ کام ہے۔ ہر حیثیت میں لحاظ ہر کمی و بیشی نہیں۔ تو رہی اگر کوئی عظیم الشان جزء ہے۔ تو رات تو ظلمت ہی ظلمت ہے۔ پھر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ رات ایسی ضروری چیز نہیں جیسے کہ دن۔ پھر مختلف ستارے۔ سیارے۔ اُن کے حرکات اُن کے ہیئات سب ایک دوسرے سے جُدا۔ لیکن نظام عالم کے لئے ہر ایک جُز ضروری ہے۔ ان کا مدارج میں ایکدوسرے سے مختلف ہونا ہی عالم کے وجود و بہبودی کا موجب ہے۔ یہی انسانی سوسائٹی کا حال ہے +

انسانی راحت کلیتہً اس کے اعمال کا نتیجہ نہیں

گذشتہ آیت کو لکھتے ہوئے میری طبیعت اس طرف آئی۔ کہ یہاں میں سورۂ یٰسین کی دوسری آیات پر بھی کچھ لکھوں جو اس موضوع پر قرآن کریم نے فرمائی ہیں۔ سورۂ یٰسین میں زیادہ تر موت اور بعد الموت زندگی کا ذکر ہے۔ اسی لئے مسلمانوں میں یہ سورۃ حالت نزع میں مریض کو سُنائی جاتی ہے۔ اسلئے ضروری تھا کہ جہاں سورۂ یٰسین حالات بعد الموت پر بحث کرے۔ وہ مسئلہ تناسخ پر بھی کچھ

روشنی ڈالے۔ کیونکہ آواگون کی حالت بھی موت کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے ⁂

قرآن کریم نے پہلے نوویں کی آیت میں یہ فرمایا۔ کہ انسان مرنے کے بعد اس دُنیا کی طرف نہیں آتا۔ فھو ھذا الم یروکم اھلکنا قبلھم من القرون انھم الیھم لا یرجعون ۝ وان کل لما جمیع لدینا محضرون (کیا نہیں دیکھتے۔ کہ اُن سے پہلے ہمنے کئی قرنوں سے لوگ ہلاک کئے۔ وہ ان کی طرف تو نہیں لوٹ کر آتے وہ سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کئے گئے ہیں)۔ پھر اہل تناسخ کی چند دلائل کو سامنے رکھ کر اُس کی تردید فرمائی۔ یہ امر تو صحیح ہے۔ کہ راحت و رنج اور آسائش و تکلیف انسان کے حسن عمل کا نتیجہ ہیں۔ اُس کے نیک اعمال اُسے راحت دیتے ہیں۔ اور اُس کے بد اعمال اُسکی تکلیف کا موجب ہوتے ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے۔ کہ ہماری کُل کی کُل راحتیں ہمارے گذشتہ جنم کے حسن اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ ہماری راحت و آسائش کے جو اصلی سامان ہیں۔ وہ کہاں تک امکانی طور سے ہمارے اعمال کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ اگر تو وہ ہمارے عمل کا نتیجہ ہیں۔ تو پھر اُن کا وجود ہمارے عمل کے بعد

ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہمارے اسباب راحت و
آسائش میں تقریباً کُل کی کُل چیزیں ہمارے وجُود سے
بہت پہلے کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ کائنات کے مظاہر
جن میں سے ہر ایک کا وجود ہماری راحت ہی نہیں۔
بلکہ ہماری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً زمین و آسمان
اور اُن میں کی کُل کی کُل چیزیں ہماری زندگی کیلئے ضروری
ہیں۔ اور ان سب کا وجود ہمارے وجود سے پہلے ہونا
چاہئے۔ علاوہ ازیں۔ جو چیزیں ہم خود اپنی راحت و آسائش
کی پیدا کر لیتے ہیں۔ اُن میں بھی ہماری محنت کا حصّہ
تو بہت ہی اقل ہے۔ انسانی آسائش کی کسی چیز کو
دیکھ لو۔ مثلاً گھر کے ظروف جو انسانی دستکاری کا نتیجہ
ہیں۔ اُن سب کے سب کا مواد انسان کے ہاتھ کا
پیدا کردہ نہیں۔ لکڑی۔ لوہا۔ تانبا۔ چاندی۔ سونا
سب کے سب پہلے ہی سے موجُود تھے۔ پھر صنّاع
کا دل و دماغ۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سب کے سب عطیّہ
ربّی ہیں۔ انسان کا عمل ایک لاشئے ہے۔ یہ پھل پھول
اناج جن پر ہماری راحت چھوڑ ہماری زندگی کا مدار ہے
یہ سب کے سب زمین سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر زمین تھو
تو کوئی چیز نہ ہو۔ پھر زمین بذات خود ایک مُردہ چیز ہے۔

زمین جب تک بارش کے پانی سے زندہ نہ ہو کسی روئیدگی
کے قابل نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ غور کا مقام ہے۔ کہ اگر
زمین نہ ہوتی۔ یا مُردہ زمین کو آسمانی پانی زندہ نہ کرتا
تو کونسی راحت کے ہم مالک ہوتے۔ ہمنے تو صرف زمین
کو کھودا ہے۔ اور اسمیں تخم ریزی کی ہے۔ پھر اُس کی
روئیدگی تو بارش چھوڑ سورج پر۔ ہَوا پر۔ زمینی مواد
پر اور ہر ایک سیارے و ستارے پر منحصر ہے۔ جنکی روشنی
حسب تعلیم قرآن زمین پر پڑکر زمین میں طاقت روئیدگی
پیدا کر دیتی ہے۔ یہ سارے اسباب راحت جن کے
مقابل انسان کا عمل ایک بے حیثیت چیز ہے۔ ہمارے
کونسے عمل کا نتیجہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ ان سب
کا وجود انسان کی زندگی سے پہلے تھا۔ کیونکہ ان کے سوا
انسان جی نہیں سکتا۔ اس حقیقت کی طرف قرآن نے نباتات
کا ذکر کرنے کے بعد کہ انسان مرکر واپس نہیں ہوتا۔ تاکہ
وہ واپس آکر گذشتہ جنم کے نیک اعمال کے عوض میں
آسائش حاصل کرے۔ ذیل کی آیت میں اشارہ فرمایا ہے

وآیۃ لھم الارض المیتۃ احییناھا واخرجنا
منہ حبًا ومنھا یاکلون وجعلنا فیھا جنّٰت من نخیلٍ واعناب
وفجرنا فیھا من العیون ہ لیاکلوا من ثمرہٖ وما عملتہ ایدیھم

افلا یشکرون + ان کے سمجھنے کے لئے مردہ زمین ہی ایک
نشان اور دلیل ہے۔ جیسے ہم (بارش کے ذریعہ) زندہ
کرتے ہیں۔ اس میں سے اناج نکالتے ہیں۔ جسے یہ
کھاتے ہیں۔ اس زمین میں ہم باغ لگاتے ہیں۔ انگور
کے کھجور کے۔ پھر اس زمین میں سے ہم چشمے نکالتے
ہیں۔ اس سے غرض یہ ہے۔ کہ وہ اس کے ثمرات
کھائیں۔ یہ باتیں تو اُن کے ہاتھوں اور عمل سے
نہیں پیدا ہوئیں۔ کیا یہ ان باتوں کی قدر نہیں کرتے
کہنے کو یہ ایک مختصر سی آیت ہے۔ لیکن انسان
کی بہترین اور بڑی سے بڑی آسائشوں کا اسمیں ذکر
کر دیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی وما عملتہ ایدیھم
(یہ تمہارے عمل کا نتیجہ نہیں) کہ کر مسئلہ تناسخ کی ایک
بڑی بھاری شق کا ازالہ کر دیا +

میں نے اس کتاب کو خدا تعالیٰ کی اُن چار صفات
سے شروع کیا ہے۔ جن سے قرآن کریم کا بھی آغاز ہوتا ہے
یعنی رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین میں نے
یہ بھی لکھا ہے۔ کہ ہم میں اور دیگر مذاہب میں اگر کہیں عقائد
کا اختلاف ہو تو اُس کی بناء یہ ہے۔ کہ صفاتِ الٰہیہ
کے متعلق جو ہمیں قرآن میں علم دیا گیا ہے۔ وہ اُن صفات

سے مختلف ہے۔ جو اَور مذاہب والے خدا کے متعلق تجویز کرتے ہیں۔ خُدا ربّ العالمین ہر ایک مخلوق کا قدم راہ ترقی میں آگے کو رکھتا ہے۔ کسی چیز کا قدم اُس کی ربُوبیت تلے نیچے پیچھے کو نہیں جا سکتا۔ لہٰذا جو انسان خدا کو ربّ العٰلمین مانتا ہے۔ وہ تناسخ کا قائل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح جو انسان ربّ العٰلمین کو رحمان مانتا ہے۔ وہ اہل تناسخ کی طرح راحت انسانی کو کسی گذشتہ جنم کے عمل کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتا۔ رحمانیت سے ربّ العٰلمین کا وہ رحم اور فضل مراد ہے۔ جو اِنسانوں کو کسی عمل کے عوض میں نہیں دیا جاتا۔ رحمٰن اور رحیم میں فرق یہ ہے۔ کہ رحمانیت کے فضل تو انسان کو بلا عوضہ عمل ملتے ہیں اور رحیمیّت کے فضل انسان کے عمل کے بعد اُس کے عوضہ میں وارد ہوتے ہیں۔ رحیمیّت پر رحمانیت کو تقدیم ہے۔ انسان کی زندگی کے لئے انسان کے عمل کے لئے اُس کی صحت اعی کے لئے سکھ درستکھ ہدم در ہدم چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ سب کے سب اُس کی زندگی سے اور اُس کے عمل سے پہلے موجود ہونی چاہئیں۔ آج تمدّن و تہذیب نے کروڑ ہا آسائش کی چیزیں پیدا کر دی ہیں لیکن یہ سب

کی سب چیزیں پہلے سے ہی دُنیا میں موجود تھیں۔ انسان نے اُنھیں دریافت کیا۔ یہ سب کی سب چیزیں خدا کی حمایت کے ماتحت پیدا ہُوئیں۔ انسان کے عمل نے صرف اسی قدر کیا۔ کہ بعض چیزوں کو بعض چیزوں سے ملا دیا اور بعض چیزوں کو بعض چیزوں سے جدا کر دیا۔ خوب غور کر کے دیکھ لو۔ کُل انسانی عمل اسی ایک جوڑ توڑ پر ہیں۔ ہماری کُل کی کُل کاریگری چیزوں کے مرکّب یا منفرد کرنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد اشیا کے خواص جو ہمارے عمل کا نتیجہ نہیں۔ کُل کا کل کام کرتے ہیں۔ ہماری آسائش کی سب چیزیں تو زمین میں موجود ہیں۔ لیکن ان چیزوں کا زمین میں پیدا ہوتا بذات خود اسباب پر حصر رکھتا ہے۔ کہ زمین پر بروقت بارشیں آئیں۔ بارشیں بادلوں کو چاہتی ہیں۔ بادلوں کا نظام حرارت آفتاب کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ اگر آٹھوں پہر بارشیں ہی ہوتی رہیں۔ تو پھر تباہی ہی تباہی ہے۔ ضروری ہے۔ کہ کسی وقت کسی حصّہ زمین پر بارش ہو۔ اور کسی وقت کسی دوسرے حصّۂ زمین پر بارش ہو یعنی کبھی کہیں بادل ہو کبھی دوسری جگہ بادل ہوں۔ سورج کی حرارت پانی کو بادل بنا دیتی ہے۔ ہوائیں ان کو

کہیں کا کہیں لیجاتی ہیں - یہ نظام بھی اُسی صورت سے پیدا
ہو سکتا ہے - جب ایک جگہ سورج زور سے چمکے تو دوسری جگہ
اُسکی درخشندگی کم ہو - تاکہ سرد مقام کی ہوائیں گرم مقام کی
کی طرف آکر اُن قطرات آب کو جو بخارات بن کر خلا میں
پھر رہے ہیں - ٹھنڈا کر کے بارش بنا دے - اس کیلئے
لازم ہے - کہ دنیا کے مختلف حصص پر مختلف اوقات
میں رات دن کی کمی بیشی ہو پھر یہی رات کی کمی بیشی مہتاب
کے ذریعہ جوار بھاٹے کا موجب ہو جاتی ہے - جس سے
سمندر میں اُتار چڑھاؤ پیدا ہو کر جہازوں کو چلانے
کا موجب ہوتا ہے - یہ سب کا سب نظام جس پر ہماری
کُل کی کُل راحت منحصر ہے - ہمارے کسی عمل کے عوض
میں ہمیں نہیں ملا - یہ سب کا سب روحانیت نے ہمیں عطا
کیا - پھر جب اس عطیہ رحمانیت پر کچھ تھوڑا سا ہمنے کام کیا
تو رحیمیت نے ہزار در ہزار گونہ عوضہ اس کا ہمیں دیا -
رحمانیت کے فیض کے پیدا ہونے کے بعد بھی اگر صرف
ہمارے عمل پر ہی حصر ہوتا - تو پھر ایک کا عوضہ ایک ہوتا
جسقدر عمل ہم کرتے - اُسیقدر نتائج مرتب ہوتے - لیکن
وہاں بھی فیض رحیمیت کام کر رہا ہے - جیسے ایک دانہ کے
عوض میں بیسیوں دانے ہوتے ہیں - یہاں بھی عمل انسانی

کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ الغرض ہماری کُل کی کُل راحتیں اور آسائشیں جو زمین سے وابستہ ہیں۔ وہ رحمانیت اور رحیمیت کا فیض ہے۔ چنانچہ اس مذکورہ بالا حقیقت کو قرآن نے ذیل کی آیت میں بیان کیا ہے۔ والٰھکم الٰہٌ واحد لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم ہ ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لاٰیت لقومٍ یعقلون (تمہارا معبود تو ایک ہی معبود ہے۔ وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ آسمان اور زمین کی پیدائش میں رات دن کی کمی بیشی میں اور سمندر میں کشتیوں کے چلنے میں جس سے انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور اُس پانی میں جو آسمان سے اُترتا ہے جس سے موت کے بعد زمین زندہ کی جاتی ہے۔ اور ہر ایک زمین میں چلنے والے جانور میں ہواؤں کے چلنے میں اور زمین و آسمان کے بادلوں کے مسخر ہوتے میں اہل عقل کے لئے نشانی ہے) +

اسی سورۂ یٰسین میں اس مسئلہ تناسخ پر بالفاظ قرآن
اس نظریہ پر کہ انسان مرکر اس دنیا میں واپس نہیں
آتا۔ اوّل تو یہ بحث کی۔ کہ تمہارے اس دنیا کے
اسباب راحت تمہارے کسی گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ
نہیں۔ بلکہ اس دنیا کے اسباب راحت کا ننانوے
فیصدی حصّہ بلکہ اس سے بھی زیادہ خدا کی رحمانیت کا
نتیجہ ہے۔ اور یہ جو اختلاف مدارج تم دیکھ رہے ہو
اس پر ہی تو تمدّن کی کل چل رہی ہے۔ اور ہر ایک
مخلوق اپنے اپنے مفوضہ کام پر لگی ہوئی ہے۔ اور اس
مفوضہ فرائض کے ادا کرنے میں نظام عالم چل رہا ہے۔
جس مسئلہ کی تشریح میں قرآن کریم نے نظام شمسی پر بحث کی
ہے۔ جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا ہے۔ اب ساتھ ہی اسباب
کے توڑنے کے لئے کہ راحت کے سامان کسی گذشتہ جنم کے
نیک عمل کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ ایک "لطیف دلیل" وہی ہے
جس میں یہ بتلایا کہ اگر خدا کا فضل نہ ہو تو تمہاری
راحت و آرام کے اسباب ہی تمہاری تباہی کا موجب
ہو جاتے ہیں۔ پھر تم اس اسباب کو بدعملی کا نتیجہ کہو گے
یا نیک عملی کا۔ چنانچہ نظام شمسی مندرجہ بالا پر بحث کرنے
کے بعد فرمایا۔ وَاٰیَۃٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ

المشحون وخلقنا لھم من مثلہ ما یرکبون ۰ وان نشأ نغرق ھم فلا صریخ لھم ولا ھم ینقذون ۔ الا رحمۃ منا ومتاعًا الی حین ۰ اور ان کے غور کرنے کے لئے کشتیاں ہی ایک نشان ہیں ۔ جن میں یہ سوار ہوتے ہیں۔ اور ایسی ہی اس قسم کی اور چیزیں جن پر یہ سواری کرتے ہیں اگر خدا تعالیٰ چاہے ۔ تو آن واحد میں بھری کی بھری کشتیاں ایسی حالت میں غرق ہو سکتی ہیں ۔ کہ جب نہ کوئی اُن کا چھوڑانے والا ہو ۔ نہ کوئی اُن کی مدد کو پہنچیں انسان کو ایسی حالت میں صرف فضل خداوندی ہی بچا سکتا ہے اسی طرح اور سواریاں بھی ہماری ہلاکت کا موجب ہو سکتی ہیں ریلیں ٹکراتی ہیں ۔ اُن کے تصادم سینکڑوں مخلوق الٰہی کو اگر موت نہیں تو طرح طرح کے عذابوں کے حوالے کردیتا ہے ۔ گھوڑوں سے لوگ گر کر مر جاتے ہیں ۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں ۔ جو ہمارے لئے اسباب راحت پیدا کرتی ہیں ۔ ان سواریوں پر خصوصاً ریل یا جہاز میں مختلف الحال لوگ ہوتے ہیں ۔ غریب امیر خواندہ جاہل ۔ بدمعاش اور نیک معاش ۔ الغرض بھرے ہوئے جہاز یا مسافروں سے لدی ہوئی ریلیں اپنے اندر اُن اشخاص کو جمع کر لیتی ہیں ۔ جو بالضرور گذشتہ جنم میں اگر تناسخ کا مسئلہ صحیح ہے تو سخت

مختلف اور متضاد الحال ہستیاں ہونگی۔ لیکن ریل اور جہاز اُن کیلئے بہت حد تک ایک ہی قسم کے اسباب راحت بہم پہنچاتے ہیں۔ اور پھر غرق ہوتے گرنے کے وقت اُن کا ایک ہی نقشہ کر دیتے ہیں۔ اُن کی موجودہ زندگیاں تو اس بات کا ثبوت ہیں۔ کہ اُن کے سابقہ جنم کی زندگی ایک دوسرے سے سخت متضاد الحال ہوگی۔ لیکن اُن کا ایک ہی اسباب راحت و مصیبت کے ماتحت جمع ہونا اس امر کی تصدیق نہیں کرتا۔ اس لئے یہ بات بالکل غلط ہے۔ کہ ہمارے اس دنیا کے اسباب راحت و رنج ہماری سابقہ جنم کی حُسن عمل یا بدعملی کا نتیجہ ہوتے ہیں +

تناسخ اور فیٹلازم ایک چیز ہیں

اس آیت کے بعد قرآن کریم نے اسی مقام پر دو اور لطیف باتیں لکھی ہیں۔ جو اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کہ ایک اہل تناسخ اگر اس مسئلہ پر عملاً ایمان رکھتا ہو۔ یعنے یہ نہیں کہ مسئلہ کو تو مانتا ہو لیکن عمل اُس کے خلاف ہو۔ ایسا انسان اس مسئلہ کے ماتحت نہ صرف دوسروں سے بعض وقت نیکی کرنے کے ہی ناقابل ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے حُسن اخلاق میں بھی کمی واقعہ ہوتی ہے۔ بلکہ عام طور پر وہ تقوے

کی راہوں سے دُور چلا جاتا ہے۔ میری اس سے یہ
مُراد نہیں۔ کہ اہل تناسخ ایسے ہوتے ہیں۔ میری
مُراد اس قدر ہے۔ کہ اگر تناسخ کے عقیدے کے
مطابق کسی کا عمل ہو تو پھر حُسنِ عمل سے وہ رہ جاتا ہے
لیکن اس مسئلہ کے ماننے والے حسنِ عمل سے تو خالی نہیں
مگر اُن کا یہ حسن عمل اس عقیدے کے تلے نہیں ہو سکتا۔
ضرورت وقتی یا حالات یا اُن کی اپنی فطرت اُن سے
یہ نیک عمل کرا رہی ہے۔ والا اگر وہ صحیح طور پر مسئلہ
تناسخ کو مانیں تو پھر ان کی حالت دگرگوں ہو۔ مثلاً
اگر ہر قسم کی تکلیف کسی گذشتہ بدعملی کا نتیجہ ہے۔ تو
یہ تکلیف تو اَن ٹل ہے۔ اس لئے اس کے دفعیہ کے
اسباب کی تلاش بیسُود ہے۔ اگر کسی کو ہیضہ یا بُخار
یا کوئی اور مرض لاحق ہو۔ اور یہ بروے نظریۂ تناسخ
کسی خاص بدعملی کا نتیجہ ہے تو پھر اُن امراض کی
شدّت یا کمی تو اُس بدعملی کے ماتحت ہے جو ہو چکی
ہے۔ اور اس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو ہو کر رہیگا۔ تو پھر
کیا ضرورت ہے۔ کہ انسان علاج کرتا پھرے چاہیئے
تو یہ تھا۔ کہ ایک تناسخ کا ماننے والا ان امراض کے پیدا
ہونے پر کچھ علاج نہ کرے۔ لیکن اُن کا علاج کرنا ہی

تناسخ کی ایک عملی تردید ہے۔ اگر یہ مسئلہ صحیح ہے۔ کہ اس جنم کی تکلیف اور راحتیں تناسخ کے ان ٹل قوانین کے ماتحت ہیں۔ تو پھر ہماری کوششیں اسباب راحت کے پیدا کرتے ہیں اور اسباب تکلیف کے دفعیہ میں سب لے سود ہیں۔ یہی وہ فیٹل ازم ہیں۔ جسے بعض لوگ اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یعنے یہ مسئلہ کہ جو ہوتا تھا سو ہو چکا۔ اور ہماری زندگی کا اچھا یا بُرا ہونا ہمارے یہاں کے آنے سے پہلے ہی طے ہو چکا۔ جسے غلطی سے مسئلہ تقدیر کہا گیا ہے۔ قرآن میں مسئلہ تقدیر تو ضرور ہے۔ لیکن اس سے مراد یہ نہیں۔ کہ ہمارے آرام و راحت ہماری نیکی بدی۔ الغرض جو کچھ بھی ہم کرتے ہیں۔ یا ہم پر واقعہ ہوتا ہے۔ وہ سب کا سب ہمارے جنم سے پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ اس مسئلہ کو جیسا کہ میں نے اوپر لکھا۔ انگریزی میں فیٹل ازم کہتے ہیں۔ اسے قرانی مسئلہ تقدیر سے کچھ نسبت نہیں۔ میں مسئلہ تقدیر پر کچھ آگے چل کر لکھونگا۔ لیکن یہاں میں تمیز کے لئے لفظ فیٹل ازم اس کتاب میں اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے استعمال کرونگا۔ یعنے جو بھی زندگی میں ہوتا ہے وہ ہو چکا ہے +

فیٹل ازم اگر کسی مذہب میں ہے۔ تو وہ یا تو مذہب عیسائیت ہے۔ یا اُن لوگوں میں جو مسئلہ تناسخ کے قائل ہیں۔ کیونکہ اگر یہ جنم اور اس کی سب اچھی یا بُری کیفیات کسی گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ تو پھر یہ سب کا سب اَن ٹل ہے۔ لہٰذا یہ فیٹل ازم ہے۔ اور انسان اس بات پر مجبور ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔ اور نہ کسی اصلاح کی طرف آئے۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ جو تناسخ کو مانتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ہیں۔ میرا مطلب کہنے کا یہی ہے کہ اُن کو اس مسئلہ کے ماتحت تو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنے حالات کو نہ بدلتے۔ لیکن ضرورت وقت اور اُن کی فطری نیکی اور اُن کے مذہب کی اور تعلیمات جو اگرچہ تعلیم تناسخ کے تو خلاف ہیں۔ لیکن اُنھیں صحیح راہوں پر چلاتی ہیں۔

عقاید وہ رکھو جن کا اثر عملی زندگی پر اچھا ہو

عقاید ہی سرچشمۂ اعمال ہوتے ہیں۔ ہماری اچھی بُری زندگی کی بُنیاد در اصل ہمارے اعتقاد ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے حُسن اعمال کے لئے حُسن عقیدگی ایک ضروری چیز ہے۔ لہٰذا ایسے عقاید کی صحت کے فیصلہ کرنے میں جس کا ثبوت یا عدم ثبوت شہودات پر تو نہ ہو محض قیاسات

دلائل اور نظریوں پر آٹھیرے تو ایک ہی راہ اختیار
کرنی چاہیئے ۔ یعنے اُن عقاید کے عملی نتائج کو دیکھا جائے
بالفاظ دیگر دیکھنا یہ ہوگا ۔ کہ ان عقائد کو مان کر انسان
میں لازماً نیکی پیدا ہوتی ہے یا بدی ۔ انسان میں
احساس جوابدہی و ذمہ واری مضبوط ہوتا ہے یا کمزور ۔
مثلاً مسئلہ کفارہ یہ تعلیم دیتا ہے ۔ کہ انسان گناہ سے تو
نجات نہیں پا سکتا اور گناہ کی پاداش میں جہنم سے بچنے
کا علاج ایک کفارہ ہے ۔ اور کفارہ ہی گناہوں کو
دھوتا ہے ۔ لہٰذا حُسن عمل کوئی چیز نہیں ۔ نہ اعمال
سے کوئی بچ سکتا ہے ۔ یہی تعلیم جناب پولوس نے دی
اور اسی تعلیم پر لوتھر جیسا عظیم الشان انسان قائم ہو کر
یہ بول اُٹھا کہ اعمال کوئی چیز نہیں ۔ تمہاری نجات
صرف کفارہ پر ایمان لانے سے ہو سکتی ہے ۔ کیا اس کا
لازمی نتیجہ یہ نہیں کہ ہم سے حُسن عمل مٹ جائے ۔ آخر مسئلہ
کفارہ کا تو لازمی نتیجہ یہی ہے ۔ جو پولوس نے کہا پھر کیوں
انسان نیکی کرے ۔ فطرت انسانی تو حُسن عمل سے جان
چراتی ہے ۔ تقوے اور پرہیزگاری کی راہیں تو بہت ہی
کٹھن ہوتی ہیں ۔ نفسانی جذبات ہی بدیوں کا سرچشمہ
ہیں ۔ دنیا میں کتنے انسان ہیں ۔ جو نفسانی جذبات کے

غلام نہیں۔ ہمنے تو دنیا میں مشہور نیکوں اور سادھوؤں کو ادنےٰ سے ادنےٰ کمزوریاں دکھاتے ہوئے دیکھا۔ انسان بدیوں سے دو ہی طریق پر بچتا ہے۔ یا تو معاصرین کا خوف یا کوئی آنیوالی تکلیف اُسے بُرے کاموں سے روک دیتی ہے۔ لیکن اگر کفارہ یہی یقین دلائے۔ کہ خواہ تم نیک عملیوں میں آسمان تک بھی پہنچ جاؤ تو بھی وہ ہیچ ہے۔ کفارہ یا مسیح کے خون پر ایمان ہی تمہیں بدعملی کی یاداش سے بچائیگا تو پھر کسی کو کیا ضرورت ہے۔ کہ نیکی کی راہوں کو اختیار کرے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اہل کفارہ بدعمل اور بدمعاش ہیں۔ اچھے بُرے سب جگہ موجود ہیں لیکن عیسائی دنیا میں جو نیک ہیں۔ اور نیکی کی راہوں پر چلتے ہیں۔ وہ عملاً کفارے کو نہیں مانتے۔ کفارہ ذمہ واری یا جوابدہی کے احساس کو خطرناک طور پر کمزور کر دیتا ہے۔ کیونکہ ذمہ واری کا احساس زیادہ تر آیندہ کے نتائج پر پیدا ہوتا ہے۔ اب اس امر کو کون جانتا ہے۔ کہ کفارہ کے ماننے والے موت کے بعد نجات پائینگے یا اُس کے منکر۔ یہ امر تو موت کے بعد ہر ایک انسان

دیکھ لیگا۔ لیکن مجھے اس مسئلہ کے ماننے میں اس لئے بھی انکار ہے۔ کہ اس سے انسان کا جذبۂ ذمہ داری کمزور ہو جاتا ہے۔ اسمیں حسن عمل کی طاقت کمزور ہو جاتی ہے۔ اسیطرح مسئلہ تناسخ کا بھی حال ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ مرنے کے بعد ہم اپنے اعمال کے مکافات میں پھر دوبارہ اس طرف آئیں گے۔ یا کسی آیندہ حالت میں (جسے اس زمینی زندگی سے تعلق نہیں) رہکر اپنے اعمال کے اچھے برے نتائج بھگتینگے۔ ان دو مسائل پر کوئی شخص اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر خصوصاً دوسرے کے لئے کوئی ناطق فیصلہ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا ان دو مسائل میں بھی فیصلے کی راہ یہی ہوگی۔ کہ ان دو عقیدوں کا عملی اثر ہماری زندگی پر کیا ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر ہمارا جذبۂ ذمہ داری اور احساس جوابدہی ان کے ماتحت کمزور ہوتا ہے یا مضبوط۔

یہاں تک تو یہ دونوں عقیدے برابر ہیں۔ کہ مکافات عمل ہوگا۔ اور ضرور ہوگا۔ اگر اس دنیا میں ہم اچھے عمل کرینگے۔ تو آیندہ زندگی میں راحت کے مستحق ہونگے۔ اور اگر اس زندگی میں برے کام کرینگے تو ہمارا آیندہ حشر برا ہوگا۔ یہ مسئلہ مکافات عمل اہل تناسخ میں ان کے مقابل مسلمان یا دیگر مومنین برابر کا ہے۔ فرق یہ آن کر پڑتا ہے

کہ اہل تناسخ والے اچھے بُرے اعمال کے نتائج بھگتنے کیلئے ہمیں یہاں واپس لاتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ یعنے مسلمان یہ تجویز کرتے ہیں۔ کہ ہم ایک ترقی کے راستہ پر ہیں اور ہمارا دوسرا جنم پہلے جنم سے اعلیٰ ہے۔ ہمیں ان جنموں میں دوسرے جنم میں ترقی کرنے کے لئے استعداد پیدا کرنی ہے۔ اس لئے حدیث نے اس دنیا کو مزرعۂ آخرت کہا۔ یہاں کچھ بوتا ہے وہاں کاٹتا ہے۔ بدعملی ہمیں آیندہ کی زندگی کی ترقی کے ناقابل کرتی ہے لیکن اس ناقابلیت کا دفعیہ کسی نہایت ہی تکلیف دہ علاج سے ہوجاتا ہے۔ اور اس کے بعد انسان راہ ترقی پر قدمزن ہوجاتا ہے۔ یہ اعتقادات ہمارے احساس ذمہ واری کو اور جذبۂ حسن عمل کو مضبوط کرتے ہیں۔ زندگی ترقی (جنت) کا شوق اور نااہلیت ترقی کے دفعیہ کے لئے خطرناک اور پُرعذاب علاجوں (جہنم) کا خوف ہمیں بدعملی سے روک سکتا ہے۔ دوسرا عقیدہ یعنے اہل تناسخ کا یہ ہے کہ ہماری آیندہ زندگی گذشتہ اعمال کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ یہاں تک تو حرج نہیں۔ لیکن چونکہ اس مسئلہ کے ماتحت یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ ہمارے موجودہ اعمال بھی خواہ اچھے ہوں یا بُرے۔ وہ پچھلے جنم کے اعمال کے ماتحت ہوتے ہیں

اور جب تک پچھلی زندگی کی بدعملیوں کا معاوضہ نہ بھگت لینگے ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اسلیئے ہمیں جو کچھ کرنا ہے عالم مجبوری میں کرنا ہے اور جو کچھ ہم کرتے ہیں اُن کی محرک گذشتہ زندگی ہے۔ اس لیئے اس عقیدہ سے اس زندگی میں جذبۂ حُسن عمل یا احساس ذمّہ واری کمزور ہو جاتا ہے +

خیر و شر کی حقیقت اور عالم عقبےٰ

اس پر یہ اعتراض ہوگا۔ کہ اسلامی یا تناسخی عقیدۂ مکافات عمل تو ایک ہی ہے۔ دونو عقیدے آیندہ زندگی کو اس زندگی پر منحصر ٹھیراتے ہیں۔ تو پھر یہاں آئے یا نہ آئے اسمیں فرق کیا۔ بات تو ایک ہی ہے۔ یہ امر صحیح ہے۔ لیکن اس اعتراض کا موجب اس دُنیا کی کیفیات اور عالم عقبےٰ کی کیفیّات کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہیں۔ عالم عقبےٰ کے متعلق اسلامی عقیدہ یہ ہے۔ کہ جو انسان اُس میں داخل ہوتا ہے۔ وہ مزید بدعملی کی اہلیت تو اپنے اندر رکھتا ہی نہیں۔ جنت وہ عالم ہے جس میں نیکی ہی نیکی ہے۔ میں پسند کرتا ہوں۔ کہ مضمون زیر بحث کو واضح کرنے کے لیئے نیکی بدی کی اصل حقیقت برعایت اختصار یہاں لکھدوں بروئے فلسفۂ اسلام جب ہمارے قوائے اپنا ودلعیت شدہ

فعل کرتے ہیں - اور اُس محل و موقعہ پر کرتے ہیں - جو اُن
کیلئے اقتضاءِ ربی نے تجویز کر رکھا ہے - تو وہی نیکی ہے - کیونکہ
اس طریق پر چلنے سے ہمارے قوٰی اپنے مخفی جوہروں
کو بلوغت تک پہنچا دیتے ہیں - جو ہر نیکی کا قرآنی مفہوم
یہی ہے - کہ ہم اپنے میں مخفی جوہروں کے نشوونما
دلانے کی اہلیت پیدا کریں - اسلئے شریعت یا دھرم کے
ماتحت کرم کانڈ کے بعض قواعد مقرر ہو جاتے ہیں - اسکے
مقابل بدی کی وہ راہیں ہیں - جن سے ہم قوائے مخفیہ کے
مشتمر کرنے کی اہلیت کھو بیٹھتے ہیں - نیکی اور بدی کا عمل
علی وجہ التجرد اپنی طبعی حالتوں میں ایک ہی ہوتا ہے -
اُن کا فعل اور موقعہ انھیں نیک و بد کر دیتا ہے - مرد عورت
کا جمع ہونا شریعت کے ماتحت یا اُس کے خلاف ایک
ہی قسم پر واقعہ ہوتا ہے - اُس کے نتائج جہانتک توالد تناسل
کا سوال ہے ایک ہی ہوتے ہیں - لیکن اُس کے بعض محل
ممدوح ہیں یعنے کسی سوسائٹی کے ماتحت مرد و عورت کا
رشتہ زوجیت میں آجانا - لیکن اگر کوئی اس کے خلاف
کرے - تو وہ زانی اور بدچلن مشہور ہوتا ہے - شادی
اور زنا عملاً تو ایک ہی ہیں - لیکن ان کے اثر جو خلاق
اور سوسائٹی پر پڑتے ہیں - انہوں نے ایک کو نیکی اور ایک کو

بدی قرار دیا ہے ۔ افیون یا دیگر زہر ہیں ۔ اپنے صحیح محل و موقعہ پر آبحیات کا کام دیتی ہیں ۔ لیکن حد مقررہ سے یا محل مناسب سے گذر نے والا ان چیزوں کے استعمال سے اپنی ہلاکت خرید لیتا ہے ۔ الغرض نیکی اور بدی اُن راہوں کا نام ہے کہ جن پر چل کر انسان کی مخفی قوتیں مثمر یا غیر مثمر ہوتی ہیں +

اب جس عالم کا نام اسلام نے عالم عقبیٰ رکھا ہے اُسکی دو حالتیں ہیں ۔ ایک تو یہ حالت ہے ۔ کہ انسان اُس عالم میں داخل ہونے پر بدی کی طرف جانے کے قطعاً ناقابل ہو جائے ۔ اس حالت کا نام جنت ہے ۔ دوسری حالت اُن انسانوں کی ہے ۔ جن میں یہ اہلیت پیدا نہیں ہوئی ۔ اُن میں بدی کی طرف جانے کی استعداد ابھی باقی ہے ۔ لیکن اسلام یہ تعلیم دیتا ہے ۔ کہ اس ارضی زندگی کی موت پر ایسی ہستیاں عالم عقبےٰ میں اپنے بد تقاضوں کے اظہار کا موقعہ نہ پائینگی ۔ بلکہ وہ ایک ایسے عالم میں اُتار دی جائینگی ۔ کہ جہاں وہ نیکی کی نا اہلیت کو یا بالفاظ دیگر بدی کی قابلیت کو اپنی فطرت سے جدا کر دیں ۔ اور اس طرح ایک عرصہ کے بعد فطرت بدی اُن میں سے مر جائے ۔ اس عالم کا نام دوزخ ہے +

مدرکۂ حیوانی و مدرکۂ انسانی میں فرق

زمینی زندگی کی غرض

میں نے کہیں پہلے بیان کیا ہے۔ کہ انسان اپنی پیدائش پر جو مدرکہ رکھتا ہے۔ وہ ایک حد تک مُدرکۂ حیوانی سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ فرق دونوں مدرکات میں یہ ہوتا ہے کہ مُدرکۂ حیوانی کسی اصلاح یا تہذیب و تعدیل کے قابل نہیں ہوتا۔ لیکن مدرکۂ انسانی میں تہذیب و تعدیل کی اہلیت ہوتی ہے۔ حیوان کے جذبات یا اشتہائیں جب تحریک پاتی ہیں۔ تو اُن اشتہاؤں کے دفعیہ میں وہ اپنے آپ کو روک ہی نہیں سکتا۔ اس کی راہ میں جب کوئی چیز دفعیہ اشتہا کی آجائے۔ تو وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں سوچتا کہ اُس چیز کا استعمال کرنا اُس کے لئے جائز ہے یا ناجائز۔ ایک گائے بھوک کے وقت اس بات کی تمیز نہیں کرتی کہ جس گھاس سے وہ اس کی اشتہا کو دفع کرتا ہے وہ اُسکے مالک سے تعلق رکھتا ہے۔ یا کسی اور سے۔ ایک سُور جذبۂ شہوت کے مشتعل ہونے پر اس بات کی تمیز نہیں کرتا۔

کہ اُس کے آگے اُس کا اپنا جوڑہ ہے یا کسی اَور کا۔
یہ باتیں تو اَور حیوانوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ لیکن
جس بات میں سُور ممتاز ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر دس سُور
جذبۂ شہوت کے زیر اشتعال ہوں۔ اور اُن کے مقابل
ایک سُورنی ہو تو وہ سب کے سب ایک جگہ جمع ہو جاتے
ہیں۔ اور یکے بعد دیگرے ایک ہی مادہ سے متمتع ہوتے
ہیں۔ دوسرے جانوروں میں تو بالضرور وقت ہیجان
پر غیرت آجاتی ہے۔ وہ دوسرے نر کو نزدیک آنے
نہیں دیتے۔ مرغ تو کسی وقت بھی دوسرے مرغ کو
اپنی مرغیوں کی طرف آنے نہیں دیتا۔ الغرض جہاں
اور جانوروں میں ہیجانی حالات پر انسانی غیرت آجاتی
ہے۔ سُور کچھ اس قدر دریا دل یا بالفاظ دیگر دیوث واقع
ہوا ہے۔ کہ اُس کے سامنے دوسرے نر اُسکی مادہ پر
قابو پالیں تو اُسے پرواہ نہیں۔ ہمنے اس دنیا میں
بھی بہت سے سُور شکل انسانی میں دیکھے ہیں جن میں
یہ دیوثی کا مادہ ہوتا ہے۔ اور یہ باتیں علے العموم
ان لوگوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ جو سُور خوری
میں کثرت کرتے ہیں۔ جیسے بعض چینی قومیں +
حیوانی مدرکہ جیساکہ میں نے اُوپر بیان کیا حقوق

کی تمیز نہیں کر سکتا۔ وہ ہیجان اشتہا پر رفع اشتہا کے لئے یہ نہیں دیکھتا کہ اشیاء سے رفع اشتہا پر اُس کا کوئی حق ہے یا نہیں۔ دُنیا میں لکھو کھا انسان آج بھی ہیں جن کا مدرکہ ابھی حیوانی حالت میں ہے۔ مُدرکۂ انسانی کا پہلا امتیاز یہ ہے۔ کہ اُسے حقُوق کا احساس پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنی اشتہاؤں کے دفعیہ میں یہ دیکھ لیتا ہے۔ کہ اشیاء سے رفع اشتہا پر اُس کا کوئی حق ہے یا نہیں۔ اسی احساس کا نام اخلاق ہے۔ وہ اپنی چیز اپنے لئے اور دوسرے کی چیز دوسرے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ خلق کی پہلی منزل ہے۔ اور اس منزل کا نام عدل ہے۔ اس سے آگے جو اخلاق اور روحانیات کی چھ منازل ارتقاء ہیں وہ ساری کی ساری قوت ایثار کے مختلف مدارج کے ماتحت پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ حیوانیت یہ ہے۔ کہ انسان کسی کے حق کی تمیز نہ کرے ہر ایک چیز کو اپنی مملوک سمجھے۔ انسانیت کے اخلاق کی پہلی منزل یہ ہے۔ کہ انسان میں تیرے اور میرے یا حقوق غیر کا احساس حقہ پیدا ہو جاتے۔ وہ اپنی چیزوں کو لیلے۔ اور دوسروں کی چیزوں کی طرف نگاہ نہ کرے۔ پھر مختلف اخلاق فاضلہ اور اُن کے بعد رُوحانیت

اُس شخص میں پیدا ہوتی ہے۔ جس کے ماتحت انسان اپنی صحیح کوششوں سے کسی چیز کو حاصل کرکے دوسروں کے فائدہ میں اُسے خرچ کر دیتا ہے۔ یعنے اپنی چیز کو جائز راہوں میں حاصل کرکے اُنھیں دوسرے کے فائدہ میں دیدیتا ہے۔ الغرض اخلاق کی پہلی منزل عدل سے شروع ہوتی ہے۔ اور اُس کی باقی کی منازل ایثار سے جسے عالم اصطلاح میں احسان و مُروّت کہتے ہیں۔ اسی غرض کے لئے انسان اس دنیا میں آیا ہے۔ کہ وہ مدرکۂ حیوانی کو اُس کمال تک پہنچادے۔ کہ وہ اس زندگی میں دوسروں کے فائدہ کے لئے جیئے۔ اگر اس دنیا میں آنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ ہمارے کُل جذبات نفسانی پر ایک قسم کی فنا واقع ہو جائے۔ اور وہ جذبات روّیہ اخلاق فاضلہ اور رُوحانیت بن جائیں تو پھر اُس کا طریق بھی یہی ہے۔ جب میں اپنی چیز کو جو میں نے محنتوں سے کمائی ہے۔ دوسروں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے۔ کہ ناجائز راہوں سے دوسروں کی چیز کو اپنی کروں۔ الغرض مدرکۂ انسانی کی تہذیب و تعدیل اسی میں ہے۔ کہ سب سے پہلے وہ عدل کی راہوں کو اختیار کرے۔ پھر لوگوں سے احسان کرنا سیکھے۔

اور احسان اور مروت میں یہانتک بڑھ جائے۔ کہ وہ غیروں
سے اس طرح برتاؤ کرے۔ جیسے وہ اپنے اہل وعیال سے
کرتا ہے۔ کیونکہ اہل وعیال کے ساتھ ہماری مروت و احسان
کسی معاوضے یا کسی شکریئے کی غرض سے نہیں ہوتی۔
اسی لئے آں حضرت صلعم نے یہ حکم دیا۔ کہ جمعہ کے خطبہ
میں ہمیشہ اس آیت کو پڑھا جائے۔ ان اللہ یامر بالعدل
والاحسان وایتاء ذی القربیٰ الخ۔ اے لوگو! اللہ تعالےٰ
تمھیں حکم دیتا ہے۔ کہ اپنے معاملات میں تم سب سے
اول عدل سے کام لو۔ اور پھر لوگوں سے احسان کرو۔ اور
احسان بھی اس قسم کا کرو جو تم اپنے اہل وعیال سے کرتے ہو
اب میں اصل مطلب کی طرف آتا ہوں۔ ہم تو اس
دنیا میں مدرکۂ حیوانی کو اس کی ادنےٰ حالت سے نکالکر
اس اعلےٰ مقام پر پہنچانے کے لئے آئے ہیں۔ کہ جہاں
اس میں بدی کی استعداد مرجائے تب یہ اس قابل ہوگا کہ
عالمِ عقبےٰ میں اپنے سفرِ حقیقی پر قدمزن ہو۔ اور اسلام
نے جیساکہ اوپر بیان ہؤا۔ عالمِ عقبےٰ کی دو ہی حالتیں
لکھی ہیں۔ ایک جنت ایک دوزخ۔ جنت تو اس کی
حالت ہے۔ جو استعداد بدی کو مدرکۂ انسانی سے نکال چکی
ہے۔ اور دوزخ اس حالت کا نام ہے۔ جس میں ابھی

وہ استعداد موجود ہے لیکن وہ ایک ایسی جگہ میں رکھ دیئے جائیں گے - کہ جہاں وہ استعداد بدی کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکینگے - یہ میں نہیں کہتا - خود قرآن کہتا ہے :-

وحیل بینھم وبین ما یشتھون

اور دوزخیوں اور اُن کی خواہشات کے درمیان پردہ ڈال دیا جائیگا -

دیکھ لو کیسے بیّن الفاظ میں قرآن کہ رہا ہے - کہ دوزخی اپنے بد تقاضوں کو پورا کرنے کی تلاش میں نکلینگے - لیکن اسباب دفع تقاضات اُنھیں نہ ملینگے - ایک شراب کا عادی جنّت میں تو داخل ہونے کے قابل نہیں - لیکن وہ ایسی حالت میں رکھا جائیگا - کہ وہ شراب کی تو تلاش کرے - لیکن اُسے شراب نہ ملے - اسمیں کیا شبہ ہے - کہ یہ زندگی نہایت تکلیف دہ ہوگی لیکن اُس کا آخر نتیجہ یہ ہوگا - کہ ایک وقت پر شراب پینے کی علت ہی اُس سے دُور ہو جائیگی - الغرض دوزخ کی ایک حقیقت یہ ہے +

سوال یہ تھا - کہ جب مکافات عمل میں اسلام اور

اہل تناسخ ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ اور آیندہ کی راحت
اور تکلیف کو اس دُنیا کے حُسن عمل یا بدعملی پر منحصر رکھتے
ہیں۔ تو پھر حالت تو ایک ہی ہے۔ لیکن نتائج بالکل
مختلف ہیں۔ اگر تو اس دنیا میں آکر ہم میں یا تو بدی
کی اہلیت نہ ہوتی یا تقاضائے بد کو پورا کرنے کے اسباب
سے ہم محروم کئے جاتے۔ تو پھر تو یہ دونوں نظریئے ایک
ہی ہیں۔ لیکن جب ہم اس دُنیا میں واپس آتے ہیں۔ اور
یہاں بدی کے اسباب بھی موجود ہیں۔ اور ہماری اہلیت
بدی کو مضبوط کرنیکے سامان بھی چاروں طرف ہیں۔ تو
اس لئے یہ دونوں مسئلے ایکدوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔
میں نے یہ کہا ہے۔ کہ کفارہ کی طرح مجھے مسئلہ
تناسخ سے اسلئے اختلاف ہے۔ کہ انسان کا جذبہ ذمہ داری
اسمیں کمزور ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کی بدزندگی کسی گذشتہ بدعملی
کا نتیجہ ہے۔ اور وہ اٹل ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے
کہ وہ بدی سے بچے۔ اسی طرح ہر قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں
اگر پچھلے جنموں کے نتائج ہیں تو یہ ہو کر رہینگے۔ پھر
اُن کے دفعیہ کے اسباب کیوں تلاش کئے جائیں۔
اسی کا نام فیٹلزم ہے۔ اور یہ تناسخ کا لازمی نتیجہ ہے۔
اس کے بالمقابل اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے۔ کہ ہم اس

دنیا میں صحیح قوٰے لے کر آئے ہیں - اُن کا استعمال ہمارے اختیار میں ہے - ہماری بہبودی یا مصیبت ہماری راحت یا تکلیف ہمارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے - الغرض ایک طرف تو یہ نظریّہ کہ میں ہی اپنی کشتی کا ملّاح ہوں میں ہی اپنے گھر کا انجنیر ہوں - میری زندگی کی بُرائی بھلائی یہاں بھی اور آیندہ بھی میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے - میں ہی اپنے آپ کو تباہ یا مرفع الحال کر سکتا ہوں - اس کے مقابل دوسرا نظریہ یہ ہے - کہ جن اچھی یا بُری حالتوں میں میں پیدا ہوا ہوں - وہ میرے ہی کسی گذشتہ عمل کا نتیجہ ہیں - اور ایسے ہی میری زندگی میں جو کچھ اچھا یا بُرا ہونیوالا ہے - وہ بھی میرے ہی گذشتہ اعمال کے آثار و اظلال ہیں اور وہ ہو کر رہینگے - وہ تو کرموں کے لیکھ ہیں - حتےّ کہ اگر میں کسی کو قتل کر بیٹھوں تو اُس کی سزا تو میری گذشتہ بدعملی کا نتیجہ ہے - لیکن میرا زید کو قتل کرنا اس لئے ہؤا ہے - کہ زید نے مجھے پہلے قتل کیا تھا - تو پھر یہ تو ایک عوض معاوضہ ہے - کیا اس قسم کے عقائد کسی کو نیکی کی راہوں پر لا سکتے ہیں - انسان تو اس عقیدہ کے ماتحت ایک مشین کی طرح ہو گیا -

جس کے چلانے والے اُسکے گذشتہ اعمال ہونگے۔جس کے ثمرات آن شامل ہیں۔اُس کی اپنی قوت ارادی تو لاشے ہے۔اُس کا بھی اگر ظہور ہوتا ہے۔ تو وہ بھی اس کے گذشتہ جنم کے اعمال کے قالب میں ہوتا ہے۔ان امُور پر غور کرنے سے یہ صاف نظر آتا ہے۔کہ مسئلہ تناسخ پر عملاً ایمان لانیوالے تقویٰ کی راہوں سے بہت دُور جا پڑتے ہیں۔ کیونکہ ذمہ واری کا احساس اس عقیدے سے لازماً کمزور ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے قرآن نے جہاں مسئلہ تناسخ پر بحث کی یہ فرمایا۔ واذا قیل لھم اتقوا ما بین ایدیکم وما خلفکم لعلکم ترحمون ۝ وما تاتیھم من ایۃ من ایات ربھم الا کانوا عنھا معرضین (سورۃ یٰسین) ان عقائد والوں کو اگر تقویٰ کی طرف بلایا جاوے۔کہ وہ ہر حال میں تقویٰ کی راہوں پر قدم زن ہوں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اُن پر رحم کرے۔ اور اُن میں نشان پر نشان اور دلائل پر دلائل بھی دیئے جائیں۔تو بھی وہ اُن باتوں سے اعراض کرتے ہیں +

میں یہ نہیں کہتا کہ تناسخ کے ماننے والے تقوے سے الگ ہیں۔ہمارے ہندو بھائی مختلف نیکیاں اپنے

اندر رکھتے ہیں۔ لیکن مقصد میرا کہنے کا یہ ہے کہ وہ اگر عملاً عقیدہ تناسخ پر کاربند ہوتے تو تقوے کی راہوں کی طرف نہ آ سکتے تھے۔

ادنےٰ یا اچھوت قوموں سے منافرت
اور
مسئلہ تناسخ

خود اس موضوع پر ہندوستان کی قدیم کتابیں دیکھی جائیں۔ مختلف قومیتوں میں پیدا ہونا مختلف عملوں کا نتیجہ سمجھا گیا ہے۔ چنڈال چمار شودر اور ساری اچھوت قومیں جب گذشتہ قبیح ترین بدعملیوں کے باعث ایسی ہستیاں ہو گئے ہیں۔ تو کیوں اس قابل سمجھی جائیں۔ کہ اُن سے چھونا تک بھی حرام ہو۔ جب ایک شخص پیدائشی اچھوت ہے۔ تو اُس کی وجہ اُس کے گذشتہ جنم کے اعمال نہیں تو اور کیا ہیں مثلاً ایک چھوٹی قوم کا شخص اگر کسی بڑی قوم یا برہمن عورت سے تعلق پیدا کرلے۔ اور پھر وہ اُس گناہ کے عوض آیندہ جنم میں چنڈالی صورت اختیار کرے۔ تو کیوں

برہمن کی نگاہ میں وہ مقہور نہ ہو۔ آج جس طرح چاہو ضرورتاً اُن اُونچی نیچی ذاتوں کی تشریح کر لو۔ لیکن کروڑ در کروڑ مخلوق کے نزدیک اس کا بڑا باعث آواگون کا ہی چکر ہے۔ مقصد میرے کہنے کا یہ ہے۔ کہ اگر ہم موجودہ سوسائٹی کے افراد کے مدارج مختلفہ کو اُن کی حیثیتوں اور ذات پات کو کسی گذشتہ جنم کے گناہ یا بدی کا نتیجہ ٹھیرائیں تو بالضرور ادنےٰ قوم کے لوگ ہماری نفرت تلے طبعاً آجائیں گے۔ اگر اپنی نسل کے کمزور اخلاق والے انسان کو ہم نفرت سے دیکھتے ہیں۔ خواہ ہم ذاتی طور سے اُس کے فعل بد سے ناواقف ہی ہوں۔ اور اُسکی بدی کے متعلق ہمارا علم محض سماعی ہو تو کسی کے گذشتہ جنم کی وہی اخلاقی کمزوری اگر اُسے اس دنیا میں مقررہ ادنےٰ حیثیت کے ماتحت لے آئے تو کیوں ہم اُس سے نفرت نہ کریں۔ یہ خالی باتیں نہیں۔ بلکہ واقعات اور حقائق ہیں۔ مسلمانوں میں اور ایسا ہی دوسری قوموں میں بھی سوسائٹی کے مختلف ہی درجے ہوتے ہیں۔ وہاں بھی ادنےٰ کام کرنے والے موجود ہیں۔ چوہڑے چمار ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن جو نفرت ایک ہندو کو طبعاً اُن ادنےٰ قوموں سے ہے۔ وہ ایک مسلمان یا انگریز کو تو

نہیں مسلمانوں میں تو بعض مہتر مُصلّی کہلاتے ہیں۔ یعنے وہ مذہب سے مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ تو ہاتھ پاؤں دھوکر اور غسل کر کے مسلمانوں میں آ بیٹھتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے۔ کہ وہ مسجدوں میں بھی جاتے ہیں۔ وہاں تو سب کے سب ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک جگہ نماز پڑھتے ہیں۔ اگر نفرت ہوتی ہے۔ تو صرف اس لئے کہ اُن کے کام پاکیزہ نہیں۔ بلکہ اُن کا کاروبار اُنھیں میلی چیزوں میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسلئے اُن سے اگر نفرت ہے۔ تو اُن کے میلے کام سے ہے۔ نہ کسی اور وجہ سے۔ انگلستان کے چوہڑے اتوار کو پاک وصاف ہو کر اچھا لباس پہن کر گرجوں میں اچھے لوگوں کے ساتھ برابر بیٹھ جاتے ہیں۔ پبلک گھروں میں اکٹھے کھاتے پیتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں ہندو سوسائٹی میں ناممکن ہیں۔ پولیٹیکل مصلحت لاکھ آریوں کو اس بات پر مجبور کرے۔ کہ وہ اچھوت کو سوسائٹی میں داخل کریں۔ لیکن ہندو مہا سبھا کبھی اجازت نہیں دیگی۔ وہ تو اصلاً اچھوت ہیں۔ اس ساری نفرت کی تہ میں اگر آواگون نہیں تو اَور کیا ہے٭

رنگون میں ایکدن میں سیر کو جا رہا تھا۔ دُور سے میں نے ایک

رکشا (گاڑی) چلانیوالے اور سواری میں متنازعہ دیکھا۔ رکشا کی سواری میں آدمی بیٹھ جاتا ہے۔ دوسرا آدمی کھینچتا ہے۔ معاملہ کچھ دلچسپ نظر آیا۔ اور میں نے اپنے رفیق سفر خلیفہ عبدالمجید کو دریافت کے لئے بھیجا۔ تکرار میں آواگون کا نام سن کر میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ جب میں قریب گیا تو دریافت پر معلوم ہوا کہ مسئلہ آواگون کے ماتحت رکشا چلانے والے نے پچھلے جنم میں رکشا کے سوار کا کوئی گناہ کیا ہوگا۔ جس کی پاداش میں وہ سوار بنتا ہے اور دوسرا رکشا کھینچتا ہے۔ مزدوری پر تکرار تھا۔ اور سوار مسافر کا یہ جواب تھا۔ کہ میں نے تو پچھلے جنم کا بدلہ لیا ہے۔ اور تم کو عذاب گناہ سے بچایا ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ تمھیں کچھ بھی عوضہ نہ دوں۔ اور تم زیادہ کیوں مانگتے ہو۔ یہ باتیں اُن میں مذاقیہ نہیں تھیں۔ بلکہ نہایت متانت سے وہ گفتگو کر رہے تھے۔ اب اگر نظام سوسائٹی نہ ہو تو عملی زندگی میں کیسی مشکل آ پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی جرم ہو۔ اُس کے تحت میں ایک نقصان رساں اور ایک نقصان یاب شخص ہوگا اور تناسخ کے نظریہ کے ماتحت اس جنم کا نقصان یاب پہلے جنم کا نقصان رساں ہوگا۔ اور یہاں کا نقصان رساں

اُس جنم کا نقصان یاب - لہٰذا اگر یہ جُرم سرزد ہوُا ہے
تو طبعی حالت میں ہوُا - گذشتہ اعمال کا تقاضا ہی
یہی تھا - یہ تو عوض معاوضہ ہوُا پھر جرائم کی مسدودی
کیوں ہو - پاداش جرم کیوں دی جائیں خیر نظام سوسائٹی
کسی کے ہاتھ میں ہو سزائیں تو ضرور بھگتنی پڑینگی -
اور اُن کو بھی کسی گذشتہ بدی کا نتیجہ سمجھ لیا جائیگا -
لیکن جرائم کا ہونا اور بدیوں کا ارتکاب ایک لازمی امر
ٹھیر جاتا ہے - اس نظریہ سے سوسائٹی کو جو نقصان
پہنچیگا وہ ظاہر ہے +

تمدّن و تہذیب اور مسئلہ تناسخ

دُنیا کا تمدّن اور ہماری کُل کی کُل ایجادیں ہماری احتیاج
سے وابستہ ہیں - ضرورت ہی ایجاد کی ماں ہے بیماریوں کے
نئے سے نئے علاج اُسی صُورت میں پیدا ہوتے ہیں
جب بیماریاں علاج پذیر سمجھی جائیں - لیکن جو سوسائٹی
اس امر کو مانتی ہے - کہ ہماری موجودہ تکلیفیں اور
ضرورتیں ہماری گذشتہ بدعملیوں کا نتیجہ ہیں - اور وہ
ہو کر رہینگی - تو پھر اُن کے دفعیہ کا کیوں علاج کیا جائے
آواگون کے ماتحت اس قسم کے ادراک کا پیدا ہو جانا

ایک طبعی امر ہے۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ تمدن اور تہذیب
میں کسی قسم کی ترقی ہو۔ ترقی خواہ علمی ہو یا حکمی اقتصادی
ہو یا تمدنی اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب یہ یقین کر لیا
جائے۔ کہ ہمارے نقص ہماری کمیاں ہماری تکالیف
سب کے سب ہمارے اپنے قصوروں سے جو اسی جنم میں
ہوئے ہیں پیدا ہوئی ہیں۔ یا وہ ہمارے فعل کا نتیجہ
ہیں۔ یا وہ ہمارے آباواجداد کی غلطیاں ہیں۔ یہ
نہیں۔ کہ وہ کسی گذشتہ جنم کی غلطیوں کے باعث
اس وقت ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ اور اس لئے اٹل
ہیں۔ اگر تو تکلیفیں ٹل سکتی ہیں۔ تو ان کا علاج بھی
انسان سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو گا۔
کہ ان کو کسی گذشتہ جنم کے عمل سے وابستہ نہ کیا جائے
مکافات عمل کے مسئلہ کو اس زندگی تک محدود کر لیا جائے تو
پھر اس کا علاج بھی سہل ہے۔ پھر علم و حکمت کے دروازے
بھی کھلتے ہیں۔ کیونکہ بدیوں یا احتیاجوں کے قابل
دفعیہ ہونے کا خیال ہی ہماری سب کوششوں کو حرکت
میں لے آتا ہے۔ جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔ یہ بھی خدا کا احسان
ہے۔ کہ ہمارے زمانہ کے لوگ عقیدتاً تو تناسخ کے قائل
ہوں۔ لیکن عملی زندگی میں ان عقیدوں کو پس پشت

ڈال دیتے ہیں۔ اس لئے کچھ نہ کچھ ترقی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں +

اچھے یا بُرے حالات میں پیدا ہونا اور مسئلہ تناسخ

میں اس موقعہ پر اس امر کی بھی تشریح کر دیتا ہوں کہ بعض کا اچھے حالات میں پیدا ہونا اور بعض کا برے حالات میں پیدا ہونا گو اُن کے فعل کا تو نتیجہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس اختلاف کو کسی آواگون کا نتیجہ ٹھیرانا سوسائٹی کے لئے من کل الوجوہ ایسا مفید نہ ہوگا۔ جیسا یہ قیاس یا ایمان کہ یہ اختلاف آبا و اجداد کے فعل حسنہ یا فعل بد کا نتیجہ ہے۔ بعض بچے کمزور خلقت کے پیدا ہوتے ہیں بعض مادرزاد نابینا اور بعض دیگر اعضاے ضروری سے محروم ہوتے ہیں۔ بعض دولت کے گہوارے میں اور بعض غربت و مسکینی کے ہاتھوں میں جنم لیتے ہیں۔ اگر ان حالات کو کسی گذشتہ جنم کے اعمال سے وابستہ کیا جائے تو پھر یہ تکلیفیں لاعلاج ہیں۔ لیکن اگر اس امر کے متعلق یہ اعتقاد رکھا جائے۔ کو ماں باپ یا کسی جد کی غلط کاری کا اثر غلط کار کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ بعض صورتوں میں اُن کی غلط کاریاں آیندہ تین چار نسل تک

بھی آنیوالی اولاد پر موثّر ہوتی ہیں۔ تو پھر ہر ایک انسان
اس بات کی احتیاط کرتا ہے۔ کہ وہ بدعملیوں سے
بچے۔ بعض انسان بعض اشتعال یا بعض تحریکات بد
کے ماتحت اگر اس بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ کہ
اُن کے کسی فعل بد کا نتیجہ اُن کی ذات پر کیا ہوگا۔ وہ
ہر بدی کے کرنے پر طیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر
کہیں وہ فعل بد سے بچ بھی جاتے ہیں تو انھیں
اپنی اولاد کا خیال آجاتا ہے۔ حفاظت و راحت
اولاد کا جذبہ ذاتی حفاظت و راحت کے جذبہ سے
بدرجہا زیادہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اس یقین و
ایمان کو افراد سوسائٹی میں مضبوط کردیا جائے۔ کہ
ہر انسان کے پیش اس کے ذاتی مفاد ہی نہیں
ہونے چاہئیں۔ بلکہ اُس کی اولاد کے مفاد
بھی اُس کے سامنے ہونے چاہئیں۔ یعنے اُنکے
عیال سے اُن کی آنیوالی نسل اچھی یا بُری ہوگی۔ ایسا
ہی علمی تحقیق و تجارب کو پبلک کے علم میں لاکر لوگوں کا
یہ یقین بڑھا دیا جائے۔ کہ اُن کی بدکاریاں نہ صرف
ان کی زندگی کو ہی تباہ کرینگی۔ بلکہ اُن کی آیندہ نسلیں بھی
نقصان یاب ہونگی۔ اسی طرح لوگوں کو یقین دلایا جائے۔ کہ عدام

جنون۔ کمزوری دماغ یا اور نقص جو بچوں میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ دراصل بچوں کے کسی گذشتہ جنم کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ یہ باپ دادوں کی بدکاریوں کے نتائج ہیں۔ تو پھر ایسا ایمان و یقین اُن لوگوں کو بہت سی بدکاریوں سے روک دے گا۔ میرا مقصد یہ ہے۔ کہ ہمارے عقاید اس قسم کے ہوتے چاہئیں۔ کہ جو نیکیوں کے محرک اور بدیوں کے روکنے والے ہوں۔ عام اس سے کہ حقیقت عقیدہ کیا ہے۔ لیکن وہ ایسے رنگ کے ہونے چاہئیں۔ کہ وہ نیک عمل کے محرک ہوں۔ اگر یہ بات صحیح ہے۔ تو اواگون کے عقیدے پر اس عقیدے کو ترجیح دینا سوسائٹی کے لئے مفید ہے کہ آنے والی نسلیں موجودہ نسل کی بدکاریوں کے نتائج ورثہ میں پاتی ہیں۔ قرآن کریم نے اس عقیدے کو پیش کیا۔ اور فرمایا۔ کہ قوا انفسکم و اھلیکم نارا۔ تم اپنے نفسوں اور اپنی اولاد کے نفسوں کو آگ سے بچاؤ۔ یاد رکھو کہ آتشک اگر دم نقد جہنم ہے۔ تو اسکی آگ تمہاری بدکاری پر نہ صرف تمہارے ہی جسم کو اس زندگی میں اپنا ایندھن بنائیگی۔ بلکہ تمہاری آیندہ دوچار نسلیں بھی اس آگ میں جلتی رہینگی۔ کتاب خروج توریت کے باب!

کے ابتدا میں جو یہ لکھا ہے۔ کہ خداوند کسی انسان کی بدعملیوں کی سزائیں چار پشت تک دیتا ہے۔ اس کی بھی یہی حقیقت ہے۔ تجربہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ سل۔ آتشک۔ تپ دق وغیرہ برابر دو تین نسلوں تک حملہ کرتی ہیں۔ یا تو ایسے خاندان دنیا سے مٹ جاتے ہیں۔ یا کسی اسباب خاصہ سے بعض وقت بچ جاتے ہیں +

اس نظریہ کے ماتحت ایک ہی بات قابل تشریح رہجاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایسے بچے جو تکلیف دہ حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ تو بذات خود بیقصور ہیں۔ اُن کا آباؤ اجداد کے قصوروں کی سزا بھگتنا کسی عدل و انصاف خداوندی کو قائم نہیں رکھتا۔ اگر اُن کی یہ تکلیفیں اُن کے اپنے کسی گذشتہ جنم کے عمل کا نتیجہ ٹھیرالی جائیں تو عدل خداوندی قائم ہو جاتا ہے یہ تو میں اُوپر بالصراحت دکھلا چکا ہوں۔ کہ غلط کاری سے روکنے اور انسان میں ذمہ واری کا احساس پیدا کرنے یا بالفاظ دیگر انسان کو اُس کے بد جذبات کے ظہور سے روکنے کے لئے آواگون کا عقیدہ مفید ثابت نہیں ہوتا بلکہ قرآنی عقیدہ عملاً مفید تر ثابت ہوگا۔ ایسا ہی اسبات سے

ہم انکار نہیں کر سکتے کہ ہم مدنی بالطبع واقع ہوئے ہیں - ہم ایکدوسرے کے افعال و اعمال سے متاثر ہوتے ہیں ہماری احتیاجیں ہی اس قسم کی ہیں - کہ اُن کے رفعیہ کے لیئے ہم سوشل زنجیروں میں جکڑے رہیں - اور ہمارے قوانین اس قسم کے ہوں - کہ ہم ایسے ہر قسم کے افعال سے قانوناً یا جبراً روکے جائیں - کہ جن کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے یہانتک کہ شرع اور قانون نے انسان کو خودکشی سے بھی روکا - کیونکہ انسانی قوتیں اُس کی اپنی ذات کے لئے نہیں - بلکہ اُس کا فائدہ دوسرے افراد سوسائٹی کو بھی پہنچتا ہے +

الغرض انسان کا فائدہ اور ہمارا اعلےٰ تمدن اسی میں ہے - کہ ہم اپنے افعال کے نتائج بد سے دوسرے افراد کو بھی بچائیں - مثال کے طور پر ایک کے گھر کو آگ لگجاتی ہے - وہ اُسکی کسی غلطی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے لیکن ہمسائے کا گھر بھی جل جاتا ہے - اگر کسی بچے کا بُری حالت میں پیدا ہوتا ہم باپ دادا کی بدکاری کی طرف اس لئے منسوب نہ کریں - کہ اس میں عدل خداوندی قائم نہیں رہتا - تو ہمسایہ کے گھر کا جل جانا کس تشریح کے تلے آئیگا اگر تو اسے بھی آواگون کے حوالہ کر دیا جائے - تو پھر ارادہ

آتش زدگیوں کا کوئی علاج نہ ہوسکیگا۔ کیونکہ ہمسایہ کا گھر جلنا بھی اُس کی کسی سابقہ جنم کی بدعملی کا نتیجہ ہے لیکن اگر عندالتحقیق یہ ثابت ہو جائے۔ کہ جس گھر میں پہلے آگ لگی تھی وہ ارادتًا تھی۔ تو پھر ہمسایہ اسبات کا مستحق ہے۔ کہ اپنے نقصان کا عوضہ لے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سوسائٹی کی صحت اور اُس کی ترقی اس ایمان و عقیدے سے وابستہ ہے۔ کہ ہم اپنی بدعملیوں کے باعث نہ صرف خود ہی سزایاب ہوں۔ بلکہ ہماری اولاد اور ہمارے ہمسائے بھی اُس سے اثر پذیر ہوں۔ سلسلۂ توالد و تناسل میں یہ امر لابد ہے۔ اگر ہمارا ایمان اس بات پر کہ ہماری بدعملیاں آئندہ دو چار نسلوں کو تباہ کردینگی اس قدر مضبوط ہو کہ جیسے ہمیں سنکھیا کے کھانے پر ہلاکت کا یقین ہے تو پھر جس قسم کی طبعی دلچسپی اور وابستگی ہم میں اپنی اولاد کے متعلق ہوتی ہے۔ وہ یقینًا ہمیں بدکاریوں سے بچا دیگی۔ ہم خوشی سے جیل میں جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے بچوں کو بے سروپا ہونا ہی ہمیں جیل کی زندگی بسر کرنے سے روک دیتا ہے۔ بعض وقت ایسے لوگوں کے بچے بطور یرغمال لے لئے جاتے ہیں۔ کہ جن سے فساد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور یہ یرغمال فساد کو روک دیتا ہے +

ضرورت تو اس بات کی ہے۔ کہ ہم میں یہ یقین مضبوط ہو جائے۔ کہ ہماری غلطیوں کے نتائج ہماری اولاد کے ورثہ میں پہنچ جائینگے۔ تو پھر وہ مضبوط دلچسپی جو انسان کو اپنی اولاد میں ہوتی ہے بالضرور ہمیں ایسے بدفعلوں سے روک لیگی۔ جو متعدی بالاثر ہوتے ہیں لیکن یہ یقین تو ہی ہم میں پیدا ہوگا۔ اگر ایسے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں یعنے ہمارے بچے ہماری بدفعلیوں سے تکلیف اُٹھائیں۔ اگر تو یہ باتیں محض استدلال ہی کے رنگ میں رہیں۔ اور خالی نظریہ ہی نظریہ ہو۔ تو اس کا نتیجہ صرف ضیعت دماغ ہے۔ جب تک ہم عملی نتائج اس قسم کے نہ دیکھ لیں۔ کہ ایک فعل بد سے آتشک زدہ کی صحت اُس کی نسلوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہ امر آج ثابت شدہ ہے۔ تب تک ہم بدعملیوں سے نہیں بچ سکتے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ کہ ان دونوں تشریحوں کی حقیقت پر تو لئی مشاہدہ یا تجربہ مُہر صداقت نہیں لگا سکتا۔ یعنے بچوں کی تکلیفیں والدین کے فعل کا نتیجہ ہیں۔ یا اُن کے کسی جنم کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ بعض بیماریوں کے

معاملہ میں اُور عُسرت اور آسائش کے حالات میں
تو ورثہ ایک امر ثابت شدہ اور بداہت تک پہنچ چکا ہے۔
بہرحال ان دونوں باتوں میں سے اِنسانی سوسائٹی
کی بہبودی قطعاً قطعاً پہلے عقیدے کے تسلیم کرنے پر
ہی حصر رکھتی ہے۔ اور آج تجربہ و مشاہدہ اور علمی
تحقیقیں بھی اس بات کو تسلیم کر رہی ہیں +

علاوہ ازیں اگر تو اس زندگی تک ہی ہمارا خاتمہ
ہو جاتا ہے۔ تو یہ ساری کی ساری تشریحات بھی فی الواقع
اطمینان نہیں دلاتیں۔ لیکن اگر اس زندگی کے بعد
ہم پر ایک اور ہستی حکمران ہے۔ جو ہماری ان تمام
تکالیف کا جس کی ذمہ وار ہمارے اعمال ہیں اچھا معاوضہ
نہیں دے سکتی ہے۔ جیسے کہ اسلام تعلیم کرتا ہے۔ ایک تو پھر
اس مختصر سی زندگی کی تکالیف ہی کیا ہے۔ جو ربانی
اقتضاء و حکمت کے ماتحت لازمی ہے۔ یعنے بچے باپ
کی غلط کاری کے وارث ہوں +

مسئلہ خیر و شر

مضمون بالا سے ملتا جلتا مسئلہ خیر و شر کا مسئلہ ہے۔ یہ
تو ظاہر ہے۔ کہ اگر انسان تناسخ کا قائل ہو جائے۔ تو

پھر بدی و شر کا ظہور لازماً گذشتہ جنم کے آثار و اظلال ہونگے۔ جس سے بدی کا دنیا سے مٹنا ایک امر محال ہو جائیگا۔ جبکہ اس جنم کے اعمال اچھے یا بُرے سارے کے سارے گذشتہ جنم کے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ تو پھر بدی ایک مستقل چیز بن جاتی ہے۔ بالمقابل اسلام نے جو روشنی مسئلہ خیر و شر پر ڈالی ہے۔ اُس سے نہ صرف بدی ایک امر اضافی ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کے قلع قمع ہونے کا امکان و علاج بھی ہوسکتا ہے +

از رُوئے تعلیم اسلام جو چیز بھی دُنیا میں پیدا ہوتی ہے یا بالفاظ دیگر خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے وہ خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز اور اُس کا ہر ایک اندازہ و مقدار مختلف نتائج پیدا کرتا ہے۔ اُن کا محل استعمال بھی مختلف ضروریات کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ جب یہ چیزیں اپنے مقررہ اندازوں پر اور مناسب محل پر استعمال ہوتی ہیں۔ تو اُن سے مفید ترین نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہی چیزیں جب اپنی صحیح موقعہ و محل پر استعمال نہ ہوں یا صحیح مقدار کا لحاظ اُن کے استعمال میں نہ کیا جائے تو مفید چیزیں ہی مہلک اور نقصان رساں ہو سکتی ہیں۔ افیون سنکھیا کچلا۔ دار چکنا۔ بھلاوہ از حد مفید اور بیش قیمت چیزیں

ہیں۔ لیکن ان کا صحیح استعمال ہی اُنھیں آبحیات بناتا ہے
ورنہ یہ تو سب کے سب سم قاتل ہیں۔ اس امر کو یہ معاملہ اور
روشن کر دیتا ہے۔ کہ بعض چیزیں بعض چیزوں سے صفات
اور خواص میں سخت مختلف اور متضاد واقع ہوئی ہیں۔ اب
کس چیز کو خیر کہا جائے۔ اور کس چیز کو شر۔ قابض اور
مُسہل چیزیں خواص میں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔
تو کیا اگر قابض اشیاء خیر ہے۔ تو مسہل اشیاء کا نام ہم شر
رکھیں۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی ضرورت پر
خیر ہی خیر ہیں۔ لیکن ایک شخص کو جو شکار اسہال ہو مسہل
چیز دینا اور وہ شخص جو قبض کا شاکی ہو اُسے قابض
چیزیں دینا ان خیر محض چیزوں کو شر بنا دیتا ہے۔
الغرض جہاں تک غور کرو کوئی خیر بھی بذات خود شر نہیں
اس کا غلط استعمال ہی اُسے شر بنا دیتا ہے۔ خود اپنے
افعال و اعمال کو دیکھ لو ایک ہی فعل محل و موقعہ کی تبدیلی
سے خیر یا شر ہو جاتا ہے۔ ایک یتیم بچہ کو اس لئے
زد و کوب کرنا کہ وہ اپنی احتیاج کے دفعیہ کے لئے ہمارے
پاس کوئی سوال کرتا ہے۔ اور ایک شریر بچہ کو غلط کاریوں
سے روکنے کے لئے تنبیہاً مارنا جہاں تک زد و کوب کا سوال
ہے۔ ایک ہی فعل ہے۔ اس کا اثر جسمانی بھی ایک ہی قسم کا ہے

دونوں بچوں کے جسم نے تکلیف پائی ہے۔ لیکن اپنے نتائج
اور محل و موقع کے لحاظ سے اگر پہلا فعل بدی اور شر ہے
تو دوسرا فعل نیکی اور خیر محض ہے۔ الغرض ہر ایک چیز میں
اور ہر ایک فعل میں ایک اندازہ خیر کا اور دوسرا اندازہ
شر کا ہوتا ہے۔ اُس کا ایک محل استعمال اگر مفید ہے
تو دوسرا محل استعمال نقصان دہ ہے۔ حالانکہ وہ محل
نقصان دہ یا وہ اندازۂ شر حالات کے بدلنے پر کسی
اور مقصد میں بعض وقت خیر اور نیکی ہو جاتا ہے۔
الغرض کوئی چیز بھی بذات خود بد نہیں۔ صرف اُنکے
غلط اندازے اور محل ہی اُن کو غیر مفید کر دیا کرتے ہیں
یہ نیکی اور بدی کے اندازے اَن مٹل ہیں۔ اور خالق
کائنات کے قرار دادہ اور تقدیر کردہ ہیں۔ جیسا کہ مسلمانوں
کے ایمانیات میں یہ امر آتا ہے۔ والقدر خیرہٖ وشرہٖ من اللہ تعالیٰ
یعنے ہر ایک چیز میں اسکی نیکی اور بدی کے اندازے مقرر ہیں۔ لفظ تقدیر
کا مفہوم اردو زبان میں غلط ہو گیا ہے۔ عربی زبان میں تقدیر کے
معنے اندازہ لگا دینے کے ہیں۔ اردو زبان میں اس لفظ کے معنے یہ ہو گئے
ہیں کہ جو کچھ کسی نے یہاں کرنا ہے۔ یا اسے پیش آنا ہے وہ
پہلے کا پہلے ہی مقرر شدہ ہے۔ اور وہ اَن مٹل ہے۔ اس مغالطہ
کا باعث اصلی یہ ہے کہ ہر چیز کے متعلق خیر و شر کے اندازے چونکہ اَن مٹل

ہیں - اس لئے جو کوئی ان اندازوں کا لحاظ نہیں کرتا - وہ ان اٹل قوانین کے ماتحت نقصان پاتا ہے - جو بدی کرتا ہے - اُس کے لئے بد نتائج اٹل ہیں - اور چونکہ یہ علت و معلول کا رشتہ یا اسباب و نتائج کا معاملہ خدا کی طرف سے اُس کے اٹل قوانین کے ماتحت ہے - اس لئے اسلامی تحریروں میں بعض ایسے نتائج کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے - اور یہ امر صحیح بھی ہے - اگر خدا تعالےٰ نے سنکھیا میں ہلاکت کے جوہر رکھے ہیں - اور جو شخص اُسے کھا کر مرتا ہے - تو گو یہ موت اُس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے - لیکن چونکہ سنکھیا میں یہ خواص اُس کے خالق نے رکھے ہیں - اس لئے یہ کہنا کہ اُس شخص کو خدا نے مارا ہے - ان معنے کے رُو سے صحیح ہے - ان دو باتوں میں اصل حقیقت کو سامنے نہ رکھنے نے جاہلوں کو اس اعتقاد پر کھڑا کر دیا ہے - کہ جو بدی اُن پر وارد ہوتی ہے - وہ خدا کی طرف سے تقدیر کردہ ہے - ہم اگر اپنے مکان میں بیٹھے ہوں - اور کھڑکیاں بند کر دیں - تو لازماً مکان تاریک ہو جائیگا - اس میں ایک فعل ہمارا ہے - اور ایک فعل قوانین قدرت یا خداوند کا - ہمارا فعل تو کھڑکی کو بند کرتا ہے - اور

خدا یا قوانین خدا کا فعل ہمیں نورِ آفتاب یا روشنی سے محروم کرتا۔ اب نور سے محروم ہوتا تو دراصل ہمارے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں نور سے محروم کیا۔ یہی حقیقت مسئلہ تقدیر کی ہے +

خیر و شر اور عقیدہ تناسخ ترقی و تنزل علوم

تشریحات بالا کے رُو سے شر یا بدی کے پیدا ہونے کے متعلق ہمارے سامنے دو نظریہ ہیں۔ ایک جو اہل تناسخ کی طرف سے ہے۔ اور دوسرا وہ جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ مسئلہ تناسخ کے ماتحت تو کل کی کل بدیاں یا تکلیفیں یا نقصان ہمارے کسی گذشتہ جنم کی بدعملی کا نتیجہ ہونگے۔ اسلئے وہ اٹل ہے۔ اس کا علاج دراصل بے سود ہے۔ اہل تناسخ بیشک بدیوں کا علاج کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس فعل سے دراصل اپنے معتقدات کی تردید کرتے ہیں۔ عقیدہ تناسخ کا تقاضا تو یہی ہے۔ کہ علاج نہ کیا جائے۔ کیونکہ کرموں کے ماتحت بدی پیدا ہوئی ہے۔ اور وہ اٹل ہے۔ اور وہ اگر اٹل ہے۔ تو اس کا علاج بے سود ہے۔ دوسری طرف

قرآنی مسئلہ کہ بدی دراصل کوئی چیز نہیں۔ چیزوں کے صحیح استعمال نہ کرنے سے بدی پیدا ہوتی ہے۔ یہ نظریہ فی الفور ہمیں اس امر پر آمادہ کر دیتا ہے کہ ہم ہر ایک چیز کے خواص کی تحقیق کریں۔ ہر ایک فعل کے نتائج پر غور کریں۔ اور اس علم کو حاصل کریں۔ کہ کسی چیز کی کونسی مقدار اُس کا کونسا اندازہ اُس کے استعمال کا کونسا محل و موقعہ نیک اور مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور کونسا اُس کے بالعکس واقع ہوُا ہے۔ یہ بات ہی ہم کو علوم کے دریافت کرنے کی طرف راغب کرتی ہے۔ اگر دنیا میں حوادث کسی گذشتہ جنم کے فعل کا نتیجہ ہیں یا مسئلہ تقدیر کے غلط مفہوم کے ماتحت وارد ہوتے ہیں۔ تو پھر ان حوادث کی روک تھام ایک بے سُود کوشش ہوگی۔ لیکن اگر یہ حوادث اسلئے واقعہ ہوئے ہیں۔ کہ ہمنے ابھی تک اُن کے صحیح اسباب کو نہیں سمجھا۔ اور اسلئے ہم اُن اسباب کے نقصان رسان محل اور موقعہ سے نہیں بچ سکے۔ اور نتیجۃً شکار حوادث ہو گئے ہیں۔ تو پھر صحیح علم آنے پر ایک نہ ایک دن ہم حوادث سے بچ جائیں گے۔ یہی امر ہمیں علم کے حصول پر آمادہ کرے گا۔ یہ جو کچھ آج

سائنس نے حاصل کرلیا ہے۔ اس کا باعث بھی یہ امر نہیں
تو اور کیا ہے۔ عقیدہ تناسخ تو ان علمی ترقیات کی طرف
انسان کو لا نہیں سکتا۔ اگر تو جہاز میں بیٹھ کر غرق ہونا ہمارے
گذشتہ جنم کے عملوں کا نتیجہ ہے۔ تو پھر ہمارا
غرق ہونا ایک اٹل بات ہے۔ لیکن اگر جہاز علی العموم
اسلئے غرق ہوتے ہیں۔ کہ بعض مختلف ہوائیں مختلف
اور متقابلہ مقامات سے اپنے مقام تصادم کے خطرناک
تلاطم پیدا کر دیتی ہیں۔ سائیکلون اس سے پیدا
ہوا کرتے ہیں۔ اور ان کے بھی پیدا ہونے کا ایک
وقت اور مقام ہے۔ تو پھر ہم اس تلاش میں لگ جائینگے
کہ ہم ان ہواؤں کے چلنے سے پہلے واقف ہو جائیں
پھر اس مقام سے بھی واقف ہو جائیں جہاں انھوں
نے جمع ہو کر تلاطم اور سائیکلون پیدا کرنا ہے۔ اب ان
ہواؤں کا چل کر تلاطم یا سائیکلون پیدا کرنا بھی اٹل
ہے۔ اور ہمارے جہاز کا اس مقام پر پہنچ کر غرق ہونا
بھی اٹل ہے۔ لیکن ہم اس مقام پر پہنچنے سے بچ
بھی سکتے ہیں۔ مثلاً میڈی ٹرینی ان سمندر کی چاروں
طرف آج رصد گاہیں ہیں۔ وہاں کے مشاہدہ کرنیوالے
مرکزی دفتر آب و ہوا میں آٹھوں پہر اطلاع دیتے رہتے

ہیں۔ کہ اُن مقامات سے ہوائیں کس رُخ پر چل رہی ہیں۔ مختلف مقامات سے مرکزی مقام پر ہر روز یہ اطلاعیں آتی ہیں۔ اور وہ اہل دفتر از رُوئے علم ہندسہ ہر وقت اندازہ لگاتے رہتے ہیں۔ کہ ان ہواؤں نے جمع ہو کر کس جگہ طوفان پیدا کرنا ہے۔ بذریعہ پیام بے سلک ہر ایک جہاز کو مقام طوفان سے اطلاع دی جاتی ہے۔ جس سے وہ اُس مقام سے بچ کر غرق ہونے سے بچ سکتا ہے۔ آج بہت حد تک طوفانوں سے جہاز بچ جاتے ہیں۔ جہاز کی زندگی اور ایک گھر کی زندگی امن و آسائش میں یکساں ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں طوفان آج بھی آتے ہیں۔ اور جہاز غرق بھی ہوتے ہیں لیکن جُوں جُوں علم بڑھتا جاتا ہے۔ حوادث کم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ علم کیا ہے۔ یہی خیر و شر کے اندازوں کا علم ہے جب تک دنیا اس خیال میں رہی۔ کہ یہ حوادث قسمت یا کرموں کا لیکھ ہے۔ اُن کے دفعیہ کا طبعاً کسی کو خیال نہ ہوا لیکن جب قرآن نے اس مسئلہ کو دُنیا میں پھیلا دیا کہ حوادث اگر شر ہو جاتے ہیں۔ تو وہ بھی مقررہ اندازوں اور قوانین کے ماتحت ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے ظہور کا موقعہ اور محل بھی اٹل ہے۔ لیکن اُن کا پیش از وقت

علم بھی ممکنات سے ہے۔ اس لیئے جو ان باتوں کا صاحب علم ہے۔ وہ ان حوادث کے موقعہ اور محل سے ایک طرف ہو کر اُن سے آسانی سے بچ سکتا ہے +

خواص الاشیاء یا قوانین فطریہ یا قوانین سوسائٹی یا قوانین گورنمنٹ بھی خیر و شر کے ہی اندازے نہیں تو اَور کیا ہے۔ کُل شرائع اور دھرم کی بُنیاد بھی خیر و شر کے اندازے ہیں۔ یہ کہنا کہ فلاں چیز اچھی ہے یا بُری ہے۔ فلاں عمل نیک ہے۔ اور فلاں عمل بد۔ یہ وہی خیر و شر کے اندازے ہیں۔ ان اندازوں کا اَٹل ہوتا ہی ہم کو نیکی کی طرف راغب کرتا ہے۔ اور بدی سے بچاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی مسئلہ تقدیر اور وہ یہ ہے۔ کہ نیک اور شر کے اندازے اَٹل ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کی طرف سے ہیں کیسی کیسی ترقیوں کا موجب ہو جاتا ہے۔ اور کیسے صحیح طریق پر شر اور بدی کو مسدود کر دیتا ہے۔ ایک شخص جو بدی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اُس کا عموماً باعث یہی ہے کہ وہ بدی کے نتائج کو اَٹل نہیں سمجھتا۔ ہم سنکھیا اس لیئے نہیں کھاتے۔ کہ اس کے کھانے پر موت کو اَٹل سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہر ایک بد عملی کے نتیجہ بد کو

اَن ٹل سمجھیں ۔ تو ممکن نہیں کہ ہم بدی کی طرف جائیں۔ جو اس لئے دن کو چوری نہیں کرتا ۔ کہ وہ تنہائی یا اندھیرے کے مقامات کو اپنے فعل بد کے لئے موزوں سمجھتا ہے ۔ وہ جانتا ہے ۔ کہ روشنی میں یا غیر تنہا جگھوں میں وہ یقیناً پکڑا جائیگا ۔ لیکن دوسرے مقامات پر یارات کے وقت اُسے اپنے فعل بد کے پاداش کا یقین نہیں ۔ اسلئے وہ چوری کرتا ہے ۔ الغرض یہ مسئلہ اسلامی کہ نیکی اور بدیوں کے نتائج اَن ٹل ہیں ۔ کیونکہ وہ خدا کی طرف سے تقدیر داده یا اندازه کرده ہیں ۔ اصلاح اخلاق میں کس قدر مفید ہیں ۔ لیکن جس عقیدے کے ماتحت بدی کا ظہور کسی گذشتہ جنم کے کارناموں کا نتیجہ ہو ۔ اور اس لئے وہ اَن ٹل ہو ۔ تو اُس کا علاج کرنا بالکل بے سُود ہے +

نتائج ایک فعل مستقبل ہے ۔ یعنے کسی فعل کے ثمرات اُس فعل کے بعد پیدا ہوتے ہیں یا بالفاظ دیگر نتیجے پر اسباب مقدم ہوتے ہیں ۔ لہٰذا جو بھی بدی ہو ۔ وہ اپنے ظہور سے پہلے کسی فعل بد کو چاہتی ہے ۔ اب اگر تو فعل بد ابھی ہمارے جنم سے تعلق رکھتا ہے تو تو رُک سکتا ہے ۔ اور اگر وہ فعل بد کسی سابق جنم میں

ہو چکا ہے۔ تو پھر اُس کے نتیجے ہیں جو بدی پیدا ہونیوالی ہے۔ وہ تو کسی صورت میں بھی رک نہیں سکتی ہم اگر اس زندگی کی بدیوں کو اسی زندگی کے افعال سے وابستہ کر دیں۔ تو پھر ایسے افعال سے بچنے کی تحریک ہم میں طبعاً پیدا ہو جائیگی۔ لیکن اگر ہم اس زندگی کی بدیوں کو کسی گزشتہ جنم کے افعال کا نتیجہ قرار دیتے ہوں۔ تو پھر وہ بدیاں تو ظاہر ہو کر ہی رہینگی۔ اس موقعہ پر میں پھر اپنے احباب اہل تناسخ کو اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ جس بات کا تکرار میں نے کئی جگہ کیا ہے۔ کہ کسی عقیدے کی صحت یا غلطی کا ایک معیار یہ بھی ہے۔ کہ کسی عقیدہ پر ایمان لانے سے انسان کسی اچھے نتائج کو حاصل کرتا ہے یا اُس کے بالعکس اُس کی زندگی واقعہ ہوتی ہے۔ اب جو مسئلہ خیر وشر کے ماتحت میں نے دو باتیں پیش کی ہیں یعنے اس جنم کے خیر وشر کے ظہور کو آواگون کے ماتحت سابقہ جنم سے وابستہ کر دینا یا تعلیم قرآن کے ماتحت اس جنم کے خیر وشر کو اسی جنم کے اعمال سے وابستہ کر دینا۔ امر اول میں تو عمل ہو چکا ہے۔ اب نتیجہ باقی ہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ وہ ان ٹل ہے۔ لہٰذا نہ نیکی کے لئے تحریک نہ بدی سے بچنے کی ترغیب۔ بالمقابل اسلامی نقطۂ خیال سے بدی اور

خیر کا ظہور ایک فعل آیندہ ہے۔ جس کا باعث کوئی ہمارا فعل ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم چاہیں تو فعل بد سے بچیں۔ اور نیک اعمال کی طرف ساعی ہوں +

ہدایت اور ضلالت

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسئلہ خیر و شر کے بعد میں مسئلہ ہدایت و ضلالت پر بھی کچھ لکھ دوں اس مسئلہ کے عدم فہم نے بھی دنیا کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیتیں کہ ہدایت و ضلالت خدا کی طرف سے ہے۔ لوگوں کو اس نتیجہ پر لے آئی ہیں۔ کہ خدا ہی لوگوں کی گمراہی کا موجب ہے اس لئے جو شر بھی دنیا میں ہوتا ہے۔ اُس کا فاعل بھی خدا ہی ہے۔ جب مسئلہ تناسخ کو صورت بالا میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور آریہ دوستوں کو دکھلایا جاتا ہے۔ کہ مسئلہ تناسخ نتیجتہً فیٹل ازم کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بدی کو انسانی ورثہ بنا دیتا ہے۔ تو اُسکے مقابل میں الزاماً وہ کہہ دیتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کے ہاں بھی مسئلہ ضلالت اسی قسم کا ہے۔ میں نے ابھی آفتاب کی اور کھڑکی کی مثال دیکر یہ ظاہر کرنا چاہا تھا۔ کہ خدا تعالےٰ

کے قوانین خیر و شر اٹل ہیں ۔ جس قانون کے ماتحت
کوئی شخص اپنے آپ کو لائیگا ۔ اُس کے نتائج سے وہ
نہ بچ سکیگا ۔ اور چونکہ یہ نتائج بھی خدا کے مقرر کردہ
قوانین کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ اس لیئے بطور فاعل
حقیقی یہ باتیں خدا کی طرف منسوب ہوتی ہیں صحیفۂ
قدرت کی کونسی چیز ہے ۔ جو ہمیں نیک و بد کی تحریک
نہیں کرتی ۔ ساون کی گھٹائیں اور بادلوں کا آجانا
ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا اگر ہمیں نیک اور مفید
باتوں کی طرف رغبت دلاتا ہے ۔ تو ایک میخوار کی
خواہش بد کو پورا کرنے کے لیئے خطرناک تحریک یہی
منظر پیدا کر دیتا ہے ۔ اگر رات کا اندھیرا اور رات
کی خاموشی ایک زاہد عابد کو اسلیئے گیان دھیان میں
لگا دیتی ہے ۔ کہ یکسوئی یا قوت ارادی کی مشق کرنے
کا وہ بہترین وقت ہے ۔ اور اُس کے زمانہ میں کسی
نکتہ پر خیال جانے کے لیئے ایسے وقت کوئی چیز مخل
نہیں ہوتی ۔ تو پھر یہی تو وہ وقت ہے ۔ جو سیاہ کاروں
کو اپنی سیاہکاری پر آمادہ کرتا ہے ۔ الغرض صحیفۂ
قدرت کا کونسا منظر ہے ۔ جو ہماری ہدایت یا گمراہی کا
کا موجب نہیں ہو جاتا ۔ البتہ یہ گمراہی اور یہ ہدایت وہ

ضلالت جس کے محرک ، کائنات سے منظر ہوتے ہیں۔ دراصل انسان کی سابقہ استعدادوں سے واقع ہوتی ہیں۔ جیسا کسی کا دل و دماغ یا اُس کے اکتساب ہوتے ہیں۔ ویسے ہی قدرتی منظروں کا اثر اس پر ہوتا ہے۔ انسان کی اپنی مکسوبہ باتیں ہی دراصل اُس کی ضلالت اور گمراہی کا موجب ہوجاتی ہیں۔ قدرت کے منظر تو بذات خود قابل الزام نہیں۔ کیونکہ اُن کا اثر ایک پر نیک اور ایک پر بد ہوتا ہے۔ یہ اثر مختلفہ اُس اختلاف طبیعت کا نتیجہ ہیں۔ جو اثر یافتہ انسان میں پہلے سے موجود ہے۔ ساون کی گھٹائیں اگر ایک رند کو میخواری کی طرف اور ایک عابد کو عبادت کی طرف لیجاتی ہیں۔ تو اسمیں شک نہیں کہ ساون کی گھٹائیں ہی بعض کی ہدایت اور بعض کی ضلالت کا موجب ہوئی ہیں۔ لیکن اُس شخص کی ضلالت کا موجب ہوئی ہیں۔ جو پہلے ہی خوراک اور صحت کے قانون توڑ چکا ہے اور شراب کا عادی بن بیٹھا ہے۔ صحیفۂ قدرت خدا تعالیٰ کی ایک فعلی کتاب ہے۔ اُس کی ہدایت اور ضلالت کے فعل کو خدا کی قولی کتاب یعنے قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔ یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیرا

وما یضل بہ الا الفاسقین - یعنے خدا کی باتیں بعضوں کی ضلالت اور بعضوں کی ہدایت کا موجب ہو جاتی ہیں - لیکن ضلالت اُنہی کے لئے ہے - جو پہلے ہی سے فاسق ہیں - اب کوئی انسان اِس آیت پر کیا اعتراض کر سکتا ہے - یہ تو وہی نقشہ ہے جو خدا کی فعلی کتاب یعنے صحیفۂ قدرت میں موجود ہے - جس کی ہر ایک کیفیت انسان کی ہدایت اور ضلالت کا موجب ہو جاتی ہے - لیکن یہ دونو باتیں انسان کی اپنی ہی استعداد کے مطابق ہوتی ہیں ٹھنڈی ہوائیں کسی کی موت اور کسی کی زندگی کا موجب ہو جاتی ہیں - اگر ایک صفراوی طبیعت انسان ٹھنڈی ہواؤں میں راحت پاتا ہے - تو ایک مسلول و مدقوق اُنہی ٹھنڈی ہواؤں سے موت خرید لیتا ہے - اب کیا یہ ٹھنڈی ہوائیں بذات خود قابل اعتراض ہیں - یہ تو دو شخصوں کی اپنی اپنی استعداد کے مطابق نتائج پیدا ہوے ہیں +

قرآن نے بعض آیات میں بیشک یہ کہا ہے - کہ ہم ہدایت دیتے اور ہم گمراہ کرتے ہیں - اُنکی حقیقت ایک تو یہی ہے - جو ہمیں نے اوپر بیان کی ہے - اُس کی

دوسری حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان بعض باتیں پیدا کرکے خدا تعالیٰ کے فتوئے ضلالت کے نیچے آجاتا ہے وہ خود اپنے افعال کے باعث اپنے اندر گمراہی کی باتیں پیدا کرچکا ہے۔ اور حکم خداوندی اُسے ان باتوں پر گمراہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح سے خدا اُسے گویا گمراہ کردیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ ایک شخص پر کسی جرم کا الزام دیا گیا ہے۔ اور وہ عدالت میں لایا گیا ہے۔ آخری فیصلۂ عدالت تک کسی کا حق نہیں۔ کہ اُسے کوئی مجرم کہے۔ عدالت کے سامنے اُس کے خلاف شہادت پیش ہوتی ہے۔ جس پر عدالت اگر متیقن ہو جائے تو اُس پر فتوئے جرم لگا دیتی ہے۔ حکم سنانے کے وقت ہر ایک جج یہی کہتا ہے۔ کہ میں تمہیں مجرم قرار دیتا ہوں۔ اس فیصلہ کے بعد مُلزم مجرم بن جاتا ہے۔ گو اُس کا مجرم بننا اسکے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہاں عدالت کے فعل نے اُسے مجرم بنایا ہے۔ گویا عدالت اُس شخص کے مجرم بنانے کا باعث ہے۔ انہی معنوں میں قرآن نے بعض جگہ یہ کہا۔ کہ خدا تعالیٰ بعض لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ یعنے اُنکے گمراہ ہو جانے کا فتوے اُن پر دیتا ہے۔ یہ کوئی خیالی

باتیں نہیں۔ قرآن نے خدا کے لئے لفظ مضل استعمال کیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا مصدر جو اضلال ہے۔ اُس کے معنے گمراہ ٹھیرانا بھی ہے۔ یعنے کسی کے حالات گمراہی پر محاکمہ کر کے اُس پر فتوئے ضلالت دینا۔ چنانچہ ذیل کا ایک شعر اس بات کی شہادت دیتا ہے ؎

ما زال شربی الراح حتی اضلنی
صدیقی وساءنی لبعل ذلکا

یہاں اضلنی صدیقی کے معنے یہ نہیں۔ کہ میرے صدیق نے مجھے گمراہ کیا۔ بلکہ مجھے گمراہ ٹھیرایا۔ یعنے میرے بعض حالات اُس کے محاکمہ کے مطابق ضلالت ٹھیرے۔

اسمیں شک نہیں۔ کہ قرآن کریم نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ بعض لوگ گونگے ہیں۔ اور بہرے ہیں۔ اور وہ ہدایت یاب نہیں ہوتے۔ بعض کے دلوں پر مُہر لگی ہوئی ہے۔ اور وہ ہدایت کی طرف نہیں آتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ وہ اس دنیا میں داخل ہوتے ہی ضلالت زدہ تھے۔ وہ ایسے ہی پیدا ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ نیکی کی طرف آ نہیں سکتے تھے یہ باتیں بھی عدم علم کا نتیجہ ہیں قرآن نے ان مسائل کو نہایت خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا

ولھم اعینٌ لا یبصرون بھا ولھم اذانٌ لا یسمعون بھا اولئک کالانعام بل ھم اضل اولئک ھم الغفلون ۔ یہ لوگ آنکھ ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے کان ہوتے ہوئے نہیں سنتے ۔ دل ہوتے ہوئے غور نہیں کرتے ۔ یہ لوگ حیوانوں کی طرح ہیں ۔ بلکہ اُن سے بھی بدتر یہ لوگ غافل ہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں ۔ جو آخر کار گونگے بہرے اور اندھے ہو جاتے ہیں ۔ جس نے آنکھ ہوتے ہوئے ارادۃً نہ دیکھا ۔ اور کان ہوتے ہوئے بات کو نہ سُنا ۔ اُس کا دل آہستہ آہستہ ایسا سخت ہو جاتا ہے ۔ کہ گویا وہ عملاً اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے ۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا ۔ کہ وہ ہدایت پانے کے معاملہ میں پیدائشی بہرے اور اندھے ہوتے ہیں ۔ نہیں اُن کے اپنے عمل اور اُن کی اپنی کارروائیاں لاپرواہیاں اور غفلتیں اُنھیں عملاً اور حالاً ایسا کر دیتی ہیں ۔ ہاں قرآن کریم نے انسان کو متنبہ کرنے کے لئے اُن حالتوں کا بھی ذکر کر دیا ہے ۔ کہ جس سے انسان میں یہ ذہنی اور رُوحانی بہرہ پن اور نابینائی پیدا ہو جاتی ہے ۔ مثلاً کوئی شخص کسی مقام پر کھڑا ہو کر کوئی بات بہ آواز بلند اسلئے کہ رہا ہے ۔ کہ لوگ سُنیں اور اُس سے فائدہ اُٹھائیں ۔ یا ایک شخص حاکم وقت کی طرف

سے ایک ڈھونڈی پیٹ رہا ہے۔ لیکن دوسرا شخص ایسی آواز کو ایک شور یا بےمعنی آواز سمجھ کر اُس پر بلا توجہ کیئے گذر جاتا ہے۔ تو پھر وہ کان ہوتے بہرہ ہو رہا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے۔ جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا

ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاءً و ندآءً صم بکم عمیٌ فھم لا یعقلون (بقرہ - ۲۳) ان لوگوں کی مثال جو نہیں مانتے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے۔ کہ ایک شخص کسی کو آواز دے (اور کچھ کہتا ہو) لیکن وہ اُسے ایک پُکار اور آواز ہی سمجھے۔ اور کچھ نہ سمجھے۔ یہی بہرے گونگے اندھے ہیں۔ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ان کے ایسے طرزِ عمل نے اُنھیں ایسا کر دیا۔ ایسا ہی وہ لوگ جو شروع سے ہی کسی صداقت سے انکار کر بیٹھے اور پھر اپنی طبیعت اس طرح بنا لے۔ کہ کسی قسم کا خوف و خطر اُن پر اثر نہ کرے۔ لاکھ اُنہیں ڈرایا جائے۔ وہ ڈرے۔ آخر کار وہ رُوحانی طور سے اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ خود تو گمراہ ہیں۔ لیکن دوسرونکو گمراہی سے نہیں روکتے۔ اسلئے وہ روحانی گونگے بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو تخویف کے سلئے

قرآن کریم نے بیان فرمایا - ان الذین کفروا سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون ہ ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم - جو کافر ایسے ہوں - کہ انھیں خواہ ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ مانتے ہی نہیں - ایسوں کے دلوں پر کانوں پر مُہر خداوندی لگ جاتی ہے - آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے - ان کے لئے عذاب عظیم ہے - اب اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے - منکرین صداقت میں سے بدترین گروہ وہی ہے - جو اپنے آپ کو نصیحت پانے سے مستغنی سمجھتا ہے - یہ نہایت ہی خطرناک حالت ہے - ایسے لوگوں کو کوئی ڈراوے یا نہ ڈراوے وہ ماننے ہی میں نہیں آتے - نصیحت تو اُسے ہی مفید ہوگی - جو کسی کی بات پر کان دھرے - عبرت وہی پکڑے گا جس کے دل میں کوئی خشیت ہو - لیکن جو ان حالتوں سے گذر چکا ہو وہ آنکھ ہوتے پر اندھا ہے - اور کان رکھنے پر بہرا ہے - اس آیت قرآنی نے تو ایسے لوگوں کا آخری نقشہ کھینچا ہے - اور انسان کو ڈرایا ہے کہ تم نصیحت سے یا تخویف سے لاپرواہ نہ ہُوا کرو - والّا تم بہرے اور اندھے ہو جاؤ گے - اور پھر کسی قسم کی

نصیحت تمھیں کارگر نہ ہوگی۔ قرآن کریم نے کیا ہی عمدہ کہا ہے
فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا۔ اُنکے دلوں
میں مرض ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کے مرض کو بڑھا دیا
جسمانیات میں یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ جب کوئی مرض
پیدا ہوئی۔ اگر اُن کا صحیح علاج نہ ہو۔ تو مرض کم نہیں زیادہ
ہوگا۔ ایک مریض نے اگر علاج سے روگردانی کی تو
خدا تعالےٰ کے مقررہ قوانین کے ماتحت وہ مرض دن بدن
بڑھیگا۔ گویا اُنکی لاپروائی اور علاج سے بے اعتنائی پر
خدا یا اُس کا قانون مرض کو بڑھائیگا۔ جو امر جسمانیات
میں ہم روز دیکھتے ہیں۔ وہی روحانی امراض کا نقشہ
ہے۔ رُوحانی مرض بھی کسی حکیم روحانی کی نصیحت پر چلنے
سے ہی دُور ہوتی ہے۔ جو نہیں چلیگا۔ اُس کی مرض
دن بہ دن بڑھتی جائیگی ؛

انسان کی ہدایت انسان سے اپنے قدم عمل کے پیچھے
پیچھے آتی ہے۔ جو کوئی مشعل ہدایت کی رہنموئی کے
مطابق قدم اُٹھاتا ہے۔ اُس کا اپنا قدم ہی اُس کے لئے
ہزاروں مشعلیں ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کہیں روشنی
ہو۔ اور ہم اُس مقام پر کھڑے ہوں تو ہماری آنکھیں
وہ چند طاقت سے کسی چیز کو دیکھ سکتی ہیں لیکن جوں جوں

ہم مقام نور سے دور ہوتے جائیں ہماری قوت بصارت بھی کم ہوتی جاتی ہے - آنکھیں بھی وہی ہیں - قوت بصارت بھی وہی ہے - لیکن ہم اپنے قدموں سے اپنے آپ کو کسی اندھیرے کے مقام پہ لے آئے ہیں - اس لئے ہماری بصارت بھی کم ہو گئی ہے - اب اگر یہ کہا جائے - کہ خدا تعالیٰ ایسے انسانوں سے اپنی روشنی کو الگ کر لیتا ہے - تو یہ کہنا صحیح ہے - کیونکہ خدا نے یہ قانون بنا رکھا ہے - کہ جو روشنی سے دور چلا جائے اس سے خدا نور لیلیگا - لیکن دراصل اس طرح نور سے جدا ہونا تو انسان کے اپنے ہی فعل کا نتیجہ ہے - ہادی یا نبی جب دنیا میں آتے ہیں - تو اُن کا وجود ایک قسم کی روشنی ہوتا ہے وہ جس مقام پر کھڑے ہوتے ہیں - وہاں ایک قسم کی آگ جلاتے ہیں - مخالفان ہدایت اُس نور ہدایت سے بھاگتے ہیں - جوں جوں ادھر آگ روشن ہوتی ہے توں توں وہ روشنی سے دور بھاگتے ہیں - حتّٰے کہ وہ اسقدر دور ہو جاتے ہیں - کہ اب اُن کے ارد گرد اندھیرا ہی اندھیرا ہے اُنھیں کچھ نظر نہیں آتا - اُن کا اس طرح اندھیرے میں چلا جانا بھی اُنہی قواعد خداوندی کے ماتحت ہے اسلئے یہ کہنا صحیح ہے - کہ جوں جوں وہ نور سے بھاگتے ہیں توں توں خدا اُنھیں اندھیرے میں ڈالتا ہے - اور وہ

اُس مقام پر پہنچ جاتے ہیں ۔ کہ پھر وہ نُور میں نہیں آسکتے۔ کیونکہ مقام نُور میں اور اُن میں گھٹا ٹوپ اندھیرا حائل ہو گیا ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن نے آیت ذیل میں اشارہ کیا ہے۔

مثلھم کمثل الذی استوقد نارا ج فلما اضاءت ما حولہ ذھب اللّٰہ بنورھم وترکھم فی ظلمٰت لا یبصرون ؕ صم بکم عمی فھم لا یرجعون ۔ ہدایت سے بھاگنے والے لوگوں کی مثال یہ ہے ۔ کہ کسی نے اُن کیلئے آگ جلائی ۔ جب آگ جلانیوالے کے اردگرد کافی روشنی ہو گئی ۔ تو اُن سے خدا روشنی لیگیا ۔ اُنھیں اندھیرے میں چھوڑ گیا ۔ جہاں یہ کچھ نہیں دیکھ سکتے ۔ یہ لوگ گونگے بہرے اور اندھے ہو گئے ۔ اور اب یہ واپس نہیں آسکتے ۔ یعنے یہ لوگ اتنی دُور چلے گئے ہیں ۔ کہ اب اُنھیں ہدایت نظر نہیں آتی ۔ نہ یہ کسی کی بات سُنتے ہیں ۔ نہ یہ کچھ دیکھتے ہیں ۔ نہ غور کرتے ہیں ۔ نہ خود کسی کو نیک راہ بتا سکنے کے قابل ہوتے ہیں ۔ الغرض یہ رُوحانی بہرہ پن یا نابینائی خدا کی طرف سے نہیں ہوتی ۔ البتّہ خدا تعالےٰ کے قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے ۔ جسمانیات اور روحانیات میں ایک ہی قانون ہے ۔ جس طرح وہاں عام حالت میں قانون کے خلاف ورزی کر کے لوگ اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں ۔ یہاں بھی

یہی حال ہے۔ اگر قرآن کریم نے کہیں کہیں یہ لکھا کہ خدا تعالیٰ دلوں پر یا کانوں پر مُہر لگا دیتا ہے۔ تو اس سے وہ مُراد نہیں جیسے معترضین نے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ جہاں جہاں ان مواہیر خداوندی کا ذکر ہے۔ وہاں ساتھ ہی اُن حالات کا ذکر بھی ہے۔ جنھیں لوگ اپنے اندر خود پیدا کر کے اپنے آپ کو مواہیر خُداوندی کے ماتحت لے آتے ہیں۔ میں ذیل میں چند آیتیں قرآن کریم سے نقل کر دیتا ہوں۔ جو نہ کسی تشریح و تفسیر کی محتاج ہیں۔ اُن کا سادہ ترجمہ کر دیتا ہوں۔ جس سے صاف ظاہر ہو گا۔ کہ جن لوگوں کے دلوں پر یا دوسرے اعضاء پر مہر خداوندی لگ جاتی ہے۔ یعنے اُنکے قوائے صحیح کام دینے سے رہجاتے ہیں۔ اور اُنکی اخلاقی و رُوحانی قوتیں مسلُوب ہو جاتی ہیں۔ یہ دراصل قوانین طبعیہ کے ماتحت ان کے اپنے فعل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ ان قوٰے سے صحیح کام لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اُنھیں اُلٹ راہ پر چلاتے ہیں۔ جس سے اُنکی قوتیں لازماً صنائع ہو جاتی ہیں۔ اسی کا نام مہر خداوندی ہے۔ یہ جو بعض ہندو فقیر ہاتھ کو کھڑا رکھتے ہیں۔ اور ایک مدت کے بعد اُنکے ہاتھ نہ صرف ہمیشہ کیلئے ہی اس حالت میں رہجاتے ہیں۔ بلکہ ہاتھ کے تمام حرکات سکنات جاتی رہتی ہیں۔ بلکہ ہاتھ اور بازو بھی خشک ہو جاتا ہے

وہ تو اُسے کمال سمجھتے ہیں۔ لیکن دراصل اُن کا ہاتھ مر چکا ہے یہ موت قوائے طبعیہ کے ماتحت واقعہ ہوئی ہیں۔ ہاتھ ایک مدت تک ضروری حرکات وسکنات سے روکا جاکر ضائع ہو جاتا ہے یہی وہ بات ہے کہ جب ان ہندو فقیروں نے اپنے قویٰ سے صحیح کام لینا چھوڑ دیا تو قوانین خداوندی یا بہ محاورہ قرآن فعل خداوندی نے اُنکے بازو اور ہاتھ پر مُہر لگادی۔ یہ ایک روزانہ مشاہدہ ہے۔ جو ذیل کی آیات کو آسانی سے قابل فہم کر دیتا ہے:۔

اذا جاءك المنٰفقون قالوا نشهد انك لرسول الله والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنٰفقين لكٰذبون ۝ اتخذوا ايمانهم جنة فصدوا عن سبيل الله انهم ساء ما كانوا يعملون ۝ ذٰلك بانهم اٰمنوا ثم كفروا فطبع على قلوبهم فهم لا يفقهون ۝ اولم يهد للذين يرثون الارض من بعد اهلها ان لو نشاء اصبنٰهم بذنوبهم ونطبع على قلوبهم فهم لا يسمعون ثم بعثنا من بعده رسلا الى قومهم فجاءوهم بالبينٰت فما كانوا ليؤمنوا بما كذبوا به من قبل كذٰلك نطبع على قلوب المعتدين ۝ واذا انزلت سورة ان اٰمنوا بالله وجاهدوا مع رسوله استاذنك اولوا الطول منهم وقالوا ذرنا نكن مع القٰعدين ۝ رضوا بان يكونوا مع الخوالف وطبع على قلوبهم فهم لا يفقهون

جب منافق تیرے پاس آتے ہیں۔ اور تیری رسالت پر شہادت دیتے ہیں۔ خدا بھی جانتا ہے کہ تو رسُول ہے۔ لیکن خدا یہ بھی شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ وہ اپنی قسموں کو اپنی سپر بناتے ہیں

خدا کی راہ سے دُور چلے جاتے ہیں - جو کرتے ہیں یقیناً بُرا کرتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے - کہ کبھی وہ ایمان لے آتے ہیں کبھی وہ چھوڑ دیتے ہیں - پھر اسکے باعث اُنکے دلوں پر مُہر لگجاتی ہے - اور اُن کی سمجھ ماری جاتی ہے - یہ جو دوسری نسل کے لوگ پہلی نسل کے بعد اُن کے وارث ہو جاتے ہیں - کیا یہ نہیں سمجھتے کہ ہم انکو (بھی) اُن ہی غلطیوں کے باعث اگر چاہیں تو تکلیف دیں - اور اُنکے دلوں پر مُہر کردیں - پھر یہ سُننے کے قابل نہیں رہینگے - نوحؑ کے بعد ہمنے اور رسول اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے - اُنہوں نے کھُلے دلائل سے باتیں سمجھائیں - لیکن چونکہ وہ پہلے ہی جھٹلا چکے تھے - اسلئے اُنھوں نے اوّل رسولونکو نہ مانا - یہی وہ مُہر ہے - جو ہم حدُود سے متجاوز ہونیوالوں کے دلوں پر لگا دیا کرتے ہیں - جب کبھی کسی سُورت نے نازل ہو کر اُنھیں حکم دیا کہ اللہ پر ایمان لاؤ - اور رسُول کے ساتھ کھڑے ہو کر سعی تام کرو - تو اُن میں کے صاحب استطاعت لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں - کہ ہمیں یہاں ہی چھوڑ جاؤ - ہم پیچھے رہینگے - اب اُنھوں نے یہ پسند کیا ہے کہ وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہیں - تو خدا بھی اُنکے دلوں پر مُہر کر دیتا ہے - وہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتے +

ازیں قبیل اور بہت سی آیتیں ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ جو لوگ دیدہ و دانستہ صداقتوں کے سُننے یا اُن پر غور کرنیسے اعراض

کرتے ہیں یا بلا سوچے سمجھے مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یا کسی بات کے سننے سے بغیر پہلے ہی سے مخالفت پر تلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یا لاپرواہی کی وجہ سے کسی امر کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے یا منافقانہ راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح محاکمے کے قابل نہیں رہتے۔ اُن کے قوائے عقلیہ صحیح کام دینا چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ اُن کا تمرد اُنھیں ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ کہ وہ ہدایت کے رستوں کو دیکھ سکتے ہی نہیں۔ نہ ہدایت کی باتوں کو سننے پر سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ بلکہ سنتے ہی نہیں۔ یہ حقائق کوئی پیچیدہ نہیں۔ بلکہ بدیہات سے ہیں۔ یہی وہ خدا کی مہر ہے۔ جو آنکھ۔ کان اور دل کو باوجود اُن کے ہونے کے بیکار کر دیتی ہے +

قرآن کریم نے اسی مسئلہ آواگون یا کرموں کی تھیوری پر گفتگو کرتے ہوئے اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اس مسئلہ کے صحیح پرستار بعض نیکیوں سے محروم رہتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ان مسائل کے ماننے والے بھی ایک ہستی کے قائل ہیں جو ہمارے اعمال پر نتائج مترتب کرتی ہے۔ انکے نزدیک بھی خدا تعالیٰ اگر ہمیں دوبارہ اس دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو ہمارا نیا قالب اسکے حکم سے ہمارے گذشتہ اعمال کے مطابق تیار ہوتا ہے۔ اگر کسی غلط کاری یا گناہ کی سزا یہی ہے کہ ہم آیندہ جنم میں بھوکے ننگے اور خلاکت زدہ پیدا ہوں تو پھر اگر خداوند نے کسی کو ایسا کر کے دنیا میں بھیجا ہے۔ تو وہ عدل خداوندی ہی کے ماتحت ہے۔ ایسے شخصوں سے اگر ہم کوئی نیک سلوک نہ کریں تو ہم غلطی

نہیں کرتے ۔ بلکہ ایسے لوگوں سے مُروّت کرنا ایک طرح گناہ ہے کیونکہ اس طرح
ہم منشاء خداوندی کی خلاف ورزی کرینگے ۔ اسکی مثال یوں ہے کہ ایک
مجرم کو حاکم وقت کوئی سزا دیتا ہے ۔ اُسے جیل میں بھیج کر خاص قسم کی
مشقتیں اُس کیلئے تجویز کرتا ہے ۔ جو شخص از راہِ ترحم ایسے سزا یافتہ
مجرم کی سزا میں یا اُس کے مصائب میں تخفیف کرانے کی کوشش
کرتا ہے ۔ یا اسکی مقررہ سزا سے اُسکو آزاد کرنے کی فکر میں لگجاتا ہے
وہ بذاتِ خود ایک جرم کا ارتکاب کرتا ہے ۔ اسی طرح کسی جنم کے بعض گناہوں نے
زید یا بکر کو عدل خداوندی کے ماتحت مفلس اور بے زر بنایا ہے ۔ اگر ہم ایسے
محتاجوں کی احتیاج کی پرواہ نہ کریں تو ہم غلطی نہیں کرتے ۔ بلکہ اگر ہم انکی
احتیاج کو پورا کریں ۔ تو ہم اُن کو روپیہ پیسہ دیتے ہیں جنہیں خداتعالے
نے محروم کر رکھا ہے ۔ چنانچہ اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم مسئلہ تناسخ
پر بحث کرتا ہوا ذیل میں فرماتا ہے +

واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ قال الذین کفروا للذین امنوا انطعم
من لو یشاء اللہ اطعمہ ان انتم الا فی ضلل مبین ۔ مومن لوگ جب ان
صداقت کے نہ ماننے والوں کو کہتے ہیں ۔ کہ خدا کی دی ہوئی چیزوں سے ان
(محتاجوں) کی مدد کرو ۔ انھیں کچھ دو تو وہ جواب میں کہتے ہیں ۔ کہ تم کیا
گمراہی کی باتیں کرتے ہو ۔ ہم ان لوگوں کو دیں یا کچھ کھلائیں جنہیں خدا نے
کچھ نہیں دیا ۔ تم خود ہی کھلی گمراہی میں ہو ۔ پچھلے جنم کے ننگے تو فیصلہ خداوندی
کے ماتحت اس حالت میں آ گئے ۔ انکے گذشتہ جنم کے عمالوں نے انھیں مفلس

اور کنگال بنایا ہے انھیں امداد دینا تو فیصلۂ خداوندی کے خلاف کرنا ہے +

پھر میں کہتا ہوں۔ کہ یہ خیالی باتیں نہیں یہ حقائق ہیں۔ اوّل تو مسئلہ کرما کے ماننے والوں کے مُنہ سے ایسی باتیں ہمنے سُنی ہیں۔ یہ مانا کہ کسی وقت انسان کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ کسی وجہ سے اُسکی طبیعت خیرات کے کاموں کی طرف نہیں آتی۔ پھر وہ طبعاً اپنے فعل کی جوازیت میں کوئی نہ کوئی امر سوچتا رہتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ کہ اُٹھتا ہے۔ کہ میاں خدا تو اُن کے گذشتہ عملوں کی سزا دے رہا ہے ہم بیچ کون ہیں جو اُنکی مدد کریں۔ الغرض کسی کی مصیبت دیکھ کر ہم میں رحم کا جوش مارتا تو طبعی امر ہے۔ اور لاکھ کوئی تناسخ مانے طبعی تقاضا اپنا عمل کیئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن بسا اوقات کرما کی فلسفی بعض طبائع میں کچھ ایسا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ کہ جس سے ہمارا رحم دب جاتا ہے۔ ہم کسی کی مصیبت زدہ حالت کو اُسکے گذشتہ گناہوں کا نتیجہ سمجھ کر اُسکی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ کیا اس دُنیا کے مجرم جب اپنے اعمال بد کی وجہ سے شکار صعوبت ہوتے ہیں۔ تو اُن کے مصائب علی العموم ہمارے رحم اور ہماری مُروّت کو کیوں جوش میں نہیں لے آتے وجہ یہ ہے۔ کہ ہم انھیں مکافات عمل کے ماتحت ان مصائب کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ اُنکی تکلیفوں کو دوسروں کی عبرت کا باعث سمجھتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کسی حاکم کے فیصلۂ عدل کے ماتحت ہوتا ہے۔ اب

اس شخص کی حالت اور کسی مادر زاد مفلس یا تکلیف زدہ کی حالت میں کیا
فرق ہے - دونوں اپنے گناہ کی پاداش میں تکلیف برداشت کر رہے ہیں
دونوں فیصلۂ عدل کے ماتحت ان حالتوں پر پہنچے ہیں - بلکہ آخر الذکر
تو صحیح طور پر اپنے اعمال کی پاداش کو بھگت رہا ہے - کیونکہ فیصلہ خداوندی
تو غلط نہیں ہو سکتا - فیصلۂ عدالت میں غلطی کا احتمال ہے - فرق صرف اسقدر
ہے - کہ ایک کی بدعملی تو ہماری آنکھوں تلے ہوئی ہو لیکن دوسرے کی
بدعملی کسی گذشتہ جنم میں تھی - یہ سچ ہے - مگر ایک عارف کی نگاہ میں اور
تناسخ کے ایک سچے پرستار کی نگاہ میں دونوں حالتیں یکساں ہیں +

اسی طرح اور بھی بہت سی اخلاقی کمزوریاں تناسخ کے صحیح پرستاروں
میں پیدا ہو سکتی ہیں - اگر پیدا نہیں ہوتیں - تو در اصل ان لوگوں کا اس
مسئلہ پر عملی ایمان نہیں - کیا یہ عام طور پر بعض آواگون کے ماننے والے
نہیں کہا کرتے کہ جو ہم سے نیکی کرتا ہے وہ در اصل اس نیکی کا عوضہ دیتا ہے جو ہم نے
کسی گذشتہ جنم میں اس سے کی - یہ بات میں نے اپنے کان سے سنی ہے! اگر
ہر ایک شخص کی نیکی کسی دوسرے کی نیکی کا عوضہ ہے - تو پھر شکر و امتنان
کا جذبہ دنیا سے مفقود ہو جاتا ہے - جب کوئی شخص ہم سے نیکی
کر کے محض عوضہ ہی کو ادا کر رہا ہے - تو وہ پھر کس شکریہ کا مستحق ہے
یہ اس مسئلہ کے منطقیانہ نتائج ہیں - ان سے مفر نہیں - اور
بالغرض اگر فہمیدہ سنجیدہ اہل تناسخ ان نتائج کے پابند نہیں - تو یہ در اصل وہ
فطرت سلیمہ ہے - جو جوہر انسان میں موجود ہے - جو اسے صحیح راہ

دکھلاتی رہتی ہے کسی کو نیکی کرتے دیکھ کر فطرت سلیمہ اور عقیدۂ تناسخ ایکدوسرے کے مخالف تقاضے پیدا کرتے ہیں۔ فطرت سلیمہ جذبہ شکریہ کو محرک کرتی ہے اور عقیدہ تناسخ اُس کے اُلٹ۔ آخر فطرت سلیمہ غالب آجاتی ہے۔ پھر ایک اور بھی مشکل ہے۔ سوسائٹی کی عامہ رائے نیکی پر اظہار شکریہ کو حسن اخلاق میں داخل کرتی ہے۔ پھر آجکل کا میل جول صرف خاص قسم کے عقیدے والوں تک محدود نہیں۔ اس عالمگیر زمانہ میں ہندو مسلمان عیسائی۔ یہودی۔ الغرض ہر عقیدے اور ہر تمدن و تہذیب کے لوگ ایکدوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ایکدوسرے سے معاملات کرتے ہیں۔ ایکدوسرے سے رشتہ اتحاد و محبت میں وابستہ ہیں۔ اب اگر اس قسم کی سوسائٹی میں اگر عام طور پر نیکی کے مقابل اظہار شکریہ ایک امر مستحسن سمجھا جائے۔ تو پھر ایک تناسخ کا پرستار اپنے عقیدے کو دبانے پر مجبور ہو جائیگا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اُس زمانہ میں جب کسی مُلک مثلاً ہند میں کل کے کُل تناسخ کے پرستار تھے۔ تو اُس وقت کیا حالت تھی۔ تاریخ تو اس پر خاموش ہے لیکن اُس زمانہ کا لیٹریچر متعلقہ مسئلہ تناسخ موجود ہے اُسے پڑھ لو تو یہ میری باتیں جو شاید کسی کو خیالی نظر آئیں کیسی حقیقت مثبتہ کا پتہ دینگی۔ وہاں تو تمام کی تمام موجودہ نیکیوں کو اور حسن عمل کو کسی گذشتہ جنم سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ ایسا ہی موجودہ بدحالیوں کی تشریح بھی انہی اصول پر کی گئی ہے۔ حتٰے کہ اگر زید سے بکر کو کوئی نقصان پہنچے تو زید نے دراصل بکر سے انتقام ہی لیا ہے۔ اسیطرح اگر بکر سے زید کو کوئی فائدہ پہنچے

تو زید کو اپنی وہی کھوئی چیز بکر سے واپس ملی ہے پھر ان نظریوں کے ماتحت کہاں جرائم کا انسداد ہو سکتا ہے۔ اور کہاں نیکی کی تحریک ہو سکتی ہے۔ اگر کسی تکلیف رسانی کے بعد میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا بلکہ میں اپنے فعل بد کو جائز سمجھ رہا ہوں۔ اور یہ مسئلہ تناسخ کا لازمی نتیجہ ہے۔ تو پھر میں آئندہ تکلیف رسانی کے امور سے کب رُک سکتا ہوں۔ پشیمانی ہی آئندہ جرائم کو روکتی ہے۔ جسمیں پشیمانی کا جذبہ مر جاتا ہے۔ وہ ہی عادی مجرم یا خطرناک غلط کار ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ تناسخ کے ماتحت انسان میں کوئی پشیمانی رہ سکتی ہے یا نہیں۔ مسئلہ انتقام اعلیٰ اخلاقیات میں مستحسن ہو۔ لیکن عام طور پر ابتدائی اخلاق کی رُو سے انتقام لینا ایک امر جائز ہے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ زید نے اگر بکر سے بدی کی تو بکر کا زید سے بدی کرنا بھی بُرا نہیں سمجھا جاسکتا۔ اب اگر انتقامی معاملہ میں انسان پشیمان نہیں ہوتا۔ تو پھر مسئلہ تناسخ کے ماتحت زید اگر بکر کو تکلیف دے رہا ہے۔ تو وہ بھی گذشتہ جنم کا انتقام لے رہا ہے۔ اس لئے اگر بعض لوگوں میں مسئلہ تناسخ جذبہ پشیمانی کو مفقود کر دے۔ تو کوئی عجب بات نہیں۔

پشیمانی کے مقابل جذبہ شکر بھی ایک عمدہ جذبہ ہے۔ یعنے کسی سے نیکی حاصل کر کے اُس کا شکر گذار ہوتا۔ یہ یاد رہے کہ تشکر و امتنان بہت سی نیکیوں کا محرک ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں * دستِ کرم کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور اپنا دان پن نہایت ہی مخفی طریق سے دیتے ہیں۔ ننانوے فیصدی لوگ شہرت اور نام کے

* جو نیکی کو بطور نیکی کر کے خوش ہو جاتے ہیں ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہیں جو

طالب ہوتے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم اس قدر تو جانتے ہیں کہ اُن کے احسان یافتہ اُن کے سامنے آنکھ نیچے رکھیں۔ اُن کی شکر گذاری میں ہمیشہ رطب اللسان رہیں۔ اب اگر ایک احسان یافتہ دوسرے کی نیکی کو اپنے کسی گذشتہ جنم کی نیکی کا عوضہ سمجھ رہا ہے تو پھر شکر گذاری کس چیز کی۔ خلاصہ یہ کہ جہاں جذبہ پشیمانی بدی کو روکتا ہے۔ وہاں جذبۂ شکر نیکی کا محرک ہوتا ہے لیکن یہ دونوں جذبے تناسخ کے مسئلہ پر صحیح اور عملی طور پر چلنے سے مر جاتے ہیں +

رنج و راحت

دُکھ سُکھ یا رنج و راحت کے سوال نے بھی مسئلہ تناسخ کو ایک طرح امداد دی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ دُکھ سُکھ بھی پچھلے کرموں کا ہی نتیجہ ہے۔ رنج و راحت کی کمی بیشی بھی سابقہ اچھے بُرے اعمال کی کمی بیشی پر حصر رکھتے ہیں۔ حالانکہ دکھ سُکھ بذات خود ایک اضافی امر ہے۔ وہی باتیں۔ جو ایک کے لئے سامان راحت پیدا کرتی ہیں۔ وہی دوسرے کیلئے دُکھ کا موجب ہو جاتی ہیں۔ کون کہ سکتا ہے کہ ایک کسان اپنی جھونپڑی میں زیادہ راحت سے رہتا ہے۔ یا ایک بادشاہ اپنے سریر سلطنت پر آرام سے سوتا ہے۔ پھر ایک کی خوشی دوسرے کی راحت سے جُدا گانہ ہوتی ہے۔ کوئی علمی خزانہ سے اپنے آپ کو مالا مال

کرنا چاہتا ہے۔ کوئی سونا چاندی سے اپنے صندوق مقفل کرتا ہے حالانکہ حقیقی راحت صرف قناعت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ سونے کا ڈھیر بھی حقیقی راحت پیدا نہیں کرتا۔ اگر کسی کی صحت ہی تباہ شدہ ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ انسانوں کے رنج و راحت میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ یہ بذاتِ خود غلط ہے۔ چہ جائیکہ اس کمی و بیشی کو کسی سابقہ بدعمل یا نیک عمل کا ثمر قرار دیا جائے۔ پھر رنج و راحت کی نوعیت جُدا جُدا ہے۔ اسی طرح سب کے سب ایک نہ ایک غم و مصیبت میں مُبتلا۔ اور اپنی اپنی طرز پر راحت و خوشی کے مالک نظر آتے ہیں +

دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ یہ مختلف اسباب رنج و راحت کہاں تک اصل مقصد زندگی میں ممد یا خارج واقع ہوتے ہیں۔ اگر اس سفر زندگی کا مقصد اتنا ہی ہے۔ کہ ملکۂ انسانی تکمیل پالے۔ اور ہم میں کے ودیعت کردہ جوہر مخفیہ بلوغت تک پہنچ جائیں تو یہ عادیہ اسباب راحت و تکلیف ایک امر زائد نظر آتے ہیں۔ کھانے پینے پہننے کی خوشی یا زوجیت و نکاح کی لذتیں آخر وہی تو ہیں جو حیوانوں میں اور ہم میں مشترک ہیں۔ موسم سرما میں سردی سے بچنے کیلئے شاید سمور و سنجاب ایک امر راحت افزا سمجھا جائے۔ لیکن اگر خدا کے نزدیک بھی یہ چیزیں ہمارے لئے ضروریات سے ہوتیں۔ تو جس طرح سمور سنجاب ایک جانور کی کھال ہے۔ یہ پشم ہمارے جسم پر بھی پیدا ہوسکتی تھی۔ آخر ان کوہستانی چوہوں کے جسم کے اجزاء طبعیہ

بحیثیت مجموعی تو وہی ہیں جو ہمارے جسم کے ہیں۔ صرف بعض اجزا کی مقدار اُن جانوروں کے جسم میں ہمارے جسم سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اور اس فرق نے ہمارے جسم پر بال اور اُن کے جسم پر خوبصورت و ملائم پشم پیدا کر رکھی ہے۔ اگر خدا چاہتا تو وہ اجزا اُنہی مقدار میں ہمارے جسم کے اندر بھی ہوتے۔ ہمارے جسم پر سنجاب و سمور کی کھال ہوتی۔ لیکن ساتھ ہی ہمارا مدرکہ یا نفسِ ناطقہ بھی اُن حیوانوں کا سا ہو جاتا۔ آج کی تہذیب نے جسقدر بھی سامانِ راحت و آسائش پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ تو اُنھیں ضروریات کے پورا کرنے کی ایک خاص صورت ہے۔ جو ہم میں اور حیوانوں میں قریب قریب مشترک ہیں۔ اسلئے ان چیزوں کو حقیقی راحت کے سامان سمجھنا ایک غلطی ہے۔ علاوہ ازیں ہماری موجودہ ضروریات کا بہت سا حصہ تو خود ہمارا ساختہ پرداختہ ہے۔ والا یہ تو کوئی ضرورتیں نہیں۔ شب سمور گذشت و شب تنور گذشت۔ کوئی سمور و سنجاب کے لحافوں میں رات بسر کر لیتا ہے۔ کوئی کمرہ کو آگ سے گرم کر کے ضروری حرارت جسم کو پہنچا دیتا ہے۔ جہاں تک سردی سے بچنے کا سوال ہے۔ وہ دونوں جگہ یکساں ہے +

اصل چیز تو نفس ناطقہ ہے۔ جس کی اصلاح اور بلوغت مطلوبہ کیلئے ہم یہاں اس دنیا میں آئے ہیں۔ جو جذبات رذیّہ

ہیں اور حیوانوں میں مشترک ہیں۔ انھیں کی تعدیل و تہذیب
ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے۔ یہی جذبات رذیلہ اصلاح و
اعتدال پاکر اخلاق فاضلہ اور روحانیات بن جاتے ہیں۔
نفسانی جذبات کے فنا ہونے پر ہی بہت سے لطائف قلبی
چمک اٹھتے ہیں۔ اسی سے اندرونی حواس جاگ پڑتے ہیں
یہ باتیں کروڑ در کروڑ انسانوں میں معدوم ہوتی ہیں۔ یہی
وہ چیز ہے جسے آتما گنتی کہتے ہیں +

اب اگر زندگی اصل غرض آتما کنتی ہے۔ تو کون کہ سکتا ہے کہ یہ
جنھیں عامۃ الناس نے اسباب رنج و راحت سمجھ رکھا ہے وہ واقعی دکھ اور
سکھ پیدا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی زر و مال کو دیکھ لو۔ ایک ہی
چیز مختلف حالات میں متضاد نتائج پیدا کرتی ہے پھر
زر و مال کو فی نفسہ ذریعۂ دکھ یا سکھ کہنا کس قدر غلطی ہے
جو انسان جذبات شہوانیہ کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کے لئے
مال و دولت ہی دراصل سم قاتل ہے۔ مال و دولت اس کے
جذبات ردیہ کو زیادہ مشتعل کر کے انھیں اور مضبوط کرتا ہے
بہتر ہوتا کہ اس کے پاس شہوانی قوتے کی آبیاری کے
سامان نہ ہوتے۔ وہ ایک افلاس کی زندگی بسر کرتا۔ اور
اپنے لئے ابدی موت نہ خریدتا۔ ایسے انسان کے لئے تو صاحب زر
ہوتا ہی موجب تکلیف اصلی ہے۔ بالمقابل وہ انسان جو اپنے

نفس پر قابو پا چکا ہے۔ اُس کے لئے دولت و مال رُوحانی ترقی کا موجب ہو جاتے ہیں۔ وہ دوسروں کے فائدہ کیلئے اور محتاجوں کے دفعیہ ضرورت میں اپنا مال و زر خرچتا ہے۔ اور آپ اُس روپیہ میں سے بہت تھوڑا حصہ لیتا ہے اس طرح یہ روپیہ اُس کے اخلاق فاضلہ کی ترقی کا موجب ہو جاتا ہے۔ یہی مثال دوسری باتوں پر بھی صادق آجاتی ہے۔ بعض وقت بعض حواس کا نہ ہونا ہی انسان کے لئے اصلی مقصد زندگی کے حصول کے واسطے مفید ہوتا ہے۔ بعض اشخاص بعض حالات کے ماتحت طبعاً ظالم طبع واقع ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس اسباب کا نہ ہونا ہی اُنھیں ظلم سے روکے رکھتا ہے۔ اب کس چیز کو ہم اصلی سُکھ اور کس کو ہم اصلی دُکھ کہیں۔ اور کن حالات پر مسئلہ تناسخ کے نتائج کو حاوی کریں +

یہ ساری باتیں صرف ایک بات سے حل ہو جاتی ہیں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ یہ زندگی بہت تھوڑے وقت کے لئے ہے۔ اور اس کے بعد ایک لمبی اور نہ ختم ہونے والی راحت و ترقی کی زندگی ہے۔ بشرطیکہ اس دورِ زندگی میں ہم اپنے آپ کو صحیح طریق پر چلائیں۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں یہاں بھی زندگی عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ہر انسان پر

چند ہی سال ایسے آتے ہیں۔ جو اُس کی کُل کی کُل زندگی
کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اُن پانچ چھ سالوں میں
اپنے آپ کو صحیح طریق پر چلا لے۔ اپنے جذبات اور
خواہشات ردیّہ پر قابو پالے۔ اور اچھی تعلیم حاصل کر لے۔ تو
آج کا غریب کُل کا امیر ہو جاتا ہے۔ دیکھ لو عام طور پر جو
لوگ آجکل بھی اچھے عہدوں پر اور اچھی عزت وحیثیت
کی زندگی پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے بہت تھوڑے
ہی ہوتے ہیں۔ جن کے والدین بھی کوئی اچھی حیثیت
کے تھے اکثر تو وہی ہیں۔ جو بہت ہی غریب اور
محتاج خاندان کے بچے تھے۔ بالمقابل امیر گھر کے
بچے والدین کا سایہ اُٹھ جانے پر عموماً تباہ ہو جاتے
ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ دولتمند گھر میں پیدا ہونا
اچھے اعمال سابق کا نتیجہ ہے۔ اور غربت کی چاردیواری
میں جنم لینا کسی اچھے کرم کا پھل ہے۔ اسی طرح یہاں
کی ساٹھ ستر سالہ زندگی گو عسرت و تکلیف میں ہی گذرے
اگر ہم میں وہ بات پیدا کر دے۔ کہ جس سے موت کے بعد
ہم لازوال راحت کے مالک ہو جائیں۔ تو پھر یہاں کا
اسباب راحت کس گنتی و شمار میں آئیں گے۔ اور
اُنھیں کس طرح بدعملی یا نیک عملی کا نتیجہ سمجھا جائیگا۔ اول تو

رنج وراحت کا کوئی معیار ہی نہیں۔ اور پھر جیسے ہم نے
اس جنم کا رنج سمجھا وہ آیندہ کے لئے باعث راحت ہوگیا
تو پھر نظریہ تناسخ کو کس طرح عملی زندگی پر حاوی کریں
اگر آیندہ جنم کی راحت کے لئے بحالات مذکورہ بالا یہ
ضروری ہے۔ کہ اس جنم کی زندگی دکھ اور تکلیف
کی ہو۔ اور یہ دُکھ و تکلیف تو آج سے پہلے کے جنم
کی بدی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ تو تیسرے جنم کی راحت حقیقی
کے حصول کیلئے آج کی زندگی بدی کی زندگی ہونی چاہئے۔ اگر
مار کھاتا۔ مصائب میں ڈالے جاتا۔ لوگوں کے ہاتھ سے
اذیت اُٹھاتا۔ تکلیف ہے۔ اور بیشک تکلیف ہے
اور اگر تکلیف کسی گذشتہ جنم کی بدی گناہ یا پاپ کا
ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ تو پھر سب سے بڑھ کر اذیت اور مصیبت تو
اس مقدس گروہ کے حصہ میں آتی ہے جنہیں رسول نبی رکھی
رشی۔ مصلح۔ ریفارمر کہا جاتا ہے۔ کیا ہم یہ قیاس کریں۔ کہ
یہ مقدس گروہ پہلے جنم میں شریر گنہگار یا فاسق فاجر تھے۔
تناسخ کا نظریہ تو ہمیں اسی پر لاتا ہے۔ حالانکہ اُن بزرگوں کا
کمال اُس تاب مقاومت و استقامت میں ہے۔ جو یہ بزرگ
اذیت کے مقابل دکھلاتے ہیں۔ اُنہیں کا سب سے بزرگ انسان
یہاں بھی اور آیندہ بھی وہی ہوتا ہے۔ جو مصائب اور تکالیف

کے مقابل اپنے حوصلہ صبر اور برداشت میں بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی
سے اُسکے اخلاق اور رُوحانیت کی ترقی ہوتی ہے۔
غور کرو۔ اگر یہی اذیت و تکلیف ہماری دولت حقیقی
کے بڑھانے میں امداد دیتی ہیں۔ تو پھر اُنھیں کسی گذشتہ جنم
کے پاپ کا عوضہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔ اس سے
تو لازم آیا۔ کہ اگر کسی آیندہ جنم میں ہمنے رکھی مُنی یا رشی
بننا ہو تو ہم اس جنم میں خاص قسم کے گناہ اور بدیاں کریں۔
اسی طرح اس زندگی میں کسی فن یا علم میں ماہر یا سرآمد
روزگار ہونا بھی طرح طرح کی تکالیف و مصائب کو چاہتا ہے
وہی لوگ آج حکومت و عزت کی کرسی پر بیٹھے نظر آتے
ہیں۔ جنھوں نے جوانی کے دن طرح طرح کی محنتوں اور
مشقتوں میں گذارے ہوتے ہیں۔ پھر کیا آیندہ نسل
کے ایک ماہر ڈاکٹر یا انجینیر یا جج یا وکیل بننے کیلئے ضروری
ہے۔ کہ اس جنم میں قسما قسم کی بدکاریاں کی جائیں کیونکہ
یہ باتیں تو تکلیف کے سوا حاصل نہیں ہو سکتیں +
ہماری زندگی کی راحت تمام تر مشقت تمام پر منحصر ہوتی
ہے۔ پھر کس کو سابقہ جنم کے نیک عمل اور کس کو بد عمل کا
ثمر قرار دیا جائے۔ یہ سب باتیں عدم معرفت سے پیدا ہوتی ہیں۔
صحیح نظریہ یہی ہے۔ کہ آیندہ کے نتائج ہی ان موجودہ بات کو بیج

راحت کا سبب ٹھہرا سکتے ہیں۔ آج کی تکلیف اُس وقت سمجھی جائیگی جب اُس کا
آیندہ نتیجہ بھی تکلیف افزا ہوا۔ لیکن آج کی تکلیف کسی آیندہ کی راحت
کا موجب ہے۔ تو پھر وہ تکلیف نہیں۔ اسی ایک بات سے آواگون کا
مسئلہ بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ کسی موجودہ تکلیف کو کسی سابقہ بدعملی کا نتیجہ سمجھنا
حالانکہ وہی تکلیف چند سالوں میں اعلےٰ راحت کے سامان پیدا کرنیوالی ہو
یا ایسا ہی موجودہ راحت کے سامانوں کو اچھے کرموں کا پھل قرار دینا جبکہ
اُنہیں سامانوں نے کسی کی چند سال کے بعد کی زندگی کو تباہ کرتا ہو
کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر ایسے مسئلہ کے ماننے سے ہمکو کیا فائدہ ہوا
کہ جس کا اثر ہمارے اعمال پر کچھ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ ہم موجودہ راحت اور تکلیف
کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ بدعملی کا یا نیک عملی کا نتیجہ ہیں ہم اسی زندگی میں
بھی کسی پر یقین نہیں ہو سکتے کہ موجودہ راحت و رنج کے اسباب چند سال بعد دکھ پیدا کرینگے یا
سکھ پھر کس چیز کو نیک عملی کا اور کس کو بدی کا نتیجہ قرار دیں۔ بہر حال جیسے کہ
میں نے بار بار اس تحریر میں کہا۔ کہ جو عقائد نظری امور اور ہسٹوریوں سے
تعلق رکھیں۔ اور اُن پر مشہود محسوس طریق سے کوئی شہادت نہ دی جائے
تو ایسے عقائد کی صحت و غلطی کا فیصلہ اس ایک طریق پر ہونا چاہئے۔ کہ
اُن عقائد کا اثر ہمارے اعمال عامہ پر کیا ہوتا ہے۔ اور اُس کے ثمرات اور
منطقی نتائج کہاں تک ایک خوشگوار منظر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یا
ان عقائد کو ماننے سے ہماری بہترین زندگی بھی کسی مکروہ اور گھنونے بادل تلے
آجاتی ہے فقط

رسالہ اشاعت اسلام - اُردو

یہ رسالہ شہرۂ آفاق رسالہ اسلامک ریویو انگریزی کا اُردو ترجمہ ہے۔ جس میں ادیان باطلہ کے زہر کا تریاق ہوتا ہے۔ تصوف و رُوحانیت پر نہایت ہی بلند پایہ مضامین اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نومسلمین کے مضامین کا اس میں ترجمہ ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ پر تنقیدی نظر کی جاتی ہے۔ محاسن اسلام کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر بھی ہر ماہ شائع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ شدھی سنگھٹن کی تحریکات کا علاج و انسداد۔ ہر ماہ نومسلمین ووکنگ کے فوٹو شائع کیے جاتے ہیں۔ سالانہ چندہ ہندوستان کے لئے للعہ جملہ امور کے متعلق خط و کتابت و ترسیل زر بنام مینیجر رسالہ اشاعت اسلام عزیز منزل برانڈرتھ روڈ۔ لاہور (پنجاب) ہونی چاہیئے +